

سب جھوٹ تھا۔

"ایک اچھا کھلاڑی کبھی ایسی فاش لٹل نہیں کرے گا۔" وہ بھی منت اور درخواست نہیں کرے گا۔  
"صرف توجہ سے اپنا کھیل کھیلے گا۔"

"اگر تم میری پروجیکٹ فائل مجھ واپس کردو تو میں لٹل کے پاس جا سکتا ہوں۔"  
"نہیں نے کہا تا ایک اچھا کھلاڑی کبھی منت نہیں کرتا۔"

وہ کمرے کی درخت سے ٹپک لگائے کھڑا تھا۔ وہ ہنسنے لے۔ اس کی ایک اہم فائل لے اڑا تھا جو اس نے کئی مہینوں کی انتھک محنت کے بعد تیار کی تھی۔ بزنس مشورہ کو لے کر یہ ایک چھوٹی سی کتاب تھی۔ جس کے لیے اس نے پبلشر سے بھی بات کر لی تھی۔ یہ کام اس نے بہت چھپا کر کیا تھا۔ لیکن مکمل اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے پہلے کمرے سے اس کی فائل غائب کی۔ پھر پبلشنگ کا پاس ورڈ توڑ کر کمپیوٹر کو کرپٹ کیا اور اس میں وائرس چھوڑ دیا کہ پبلشنگ ٹپک ٹھیک ہونے کے بعد بھی اس کی مرنے والی فائلوں کو مرنے کو روک دیا جائے۔

ایک بڑا کھلاڑی ہونے کی حیثیت سے عالمیان نے اس کی کئی منت کی کہ وہ اسے اس کی فائل دے دے۔ لیکن اس نے نہیں دی۔ بدلے میں اسے لٹل کو بھڑکانا پڑا۔ وہ جانتا تھا۔ کامل لٹل کو بہت پسند کرتا ہے اور اس کے ساتھ فوج پلاننگ کر رہا ہے۔ اس نے لٹل کے دل میں اسے لے کر کافی کچھ ڈال دیا تھا۔

اس سے بھی بڑھ کر اس نے یہ کیا کہ اپنے قیمتی وقت میں سے وقت نکال کر لٹل کو وٹا شروع کر دیا۔ ایک جنرل کے مقابلے میں اسے عالمیان جیسا لائق فائق لڑکا زیادہ اچھا لگا۔ ایک ہی ہفتے میں دس چار بار لڑ کر دونوں الگ ہو گئے اور ظاہر ہے کامل جانتا تھا یہ سب کیوں ہوا۔ کس نے کیا۔

کامل کمرے سے چلا گیا اور ٹھیک پانچ منٹ بعد واپس آیا اور کہا۔

"اور اپنے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھو۔"

عالمیان نے اس کے ہاتھ کے اشارے کی سمت دیکھا۔ Withworth پارک۔ (اسٹوڈنٹس کی رہائش گاہ) کے گراؤنڈ میں کوئی چیز جل رہی تھی۔ آگ کے قطرے اٹھ رہے تھے اس میں سے۔

وہ عالمیان کی مستقبل قریب میں آنے والی کتاب تھی جو اب آگ کے حوالے تھی۔

عالمیان نے لب سختی سے بھینچ لے۔  
"پہلے میں اس مسئلے کو اپنے نام سے چھوٹے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لیکن اب کھڑے کھڑے میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ چند ہزار پونڈ کا نقصان کچھ زیادہ تو نہیں۔" کامل کہہ کر چلا گیا۔

کامل ہیٹ اسے پوری جوت دے کر جاتا تھا۔ اس کا بڑا نقصان کرتا تھا۔ دونوں ضدی تھے اور وہ لہلہ ہی باز نہیں آ رہے تھے۔ لیکن اب عالمیان سب ختم کر گیا تھا۔ وہ اپنے منہ سے کہہ گیا تھا کہ اسے اب یہ کھیل اور نہیں کھیلنا۔ ماضی میں یہ سب کرتے اس نے کبھی آگے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ کامل کا بریک اپ کروانے بھی نہیں۔ لیکن اب وہ خول نہ ہو گیا تھا۔ کیسے لکھوں میں اس نے امرتہ کو لاک کر دیا تھا۔ وہ اسے کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔ لیکن کیا مظلوم کسی چھوٹے نقصان کسی معمولی شرارت میں ہی بڑا نقصان چھپا ہو۔

کامل چھپ کر وار کیا کرتا تھا۔ بظاہر ایسے ظاہر کرتا جیسے سب ٹھیک ہے اور وہ کچھلی چوٹ بھول چکا ہے۔ لیکن پھر نئی چوٹ دے کر وہ ایسے مسکراتا جیسے کہہ رہا ہو۔

"زندگی کا اصل مزا اسی کھیل میں ہے۔ اور جس چیز میں مزا ہو۔ اسے چھوڑنے کو کس کا دل چاہتا ہے۔"

\*\*\*

صبح ویرانے اس کے کمرے میں آتے ہی اس کا لطف کچھ بگڑتا اور چونک کر رہ جاتا۔  
"تمہاری بات بھرنی رہی ہو۔"



مجھے وہاں دیکھ لیتا "کامل نے دھوکے سے مجھے اسٹور میں بند کر دیا۔"

"تیز میوزک نے تمہارے کانوں کے پردے ہلا والے ہوں گے تمہاری عقل کے نہیں۔ تم عقل کا مظاہرہ بھی کر سکتی تھیں۔"

ویرا ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہ عقل کا مظاہرہ بھی کر سکتی تھی۔

"میں نے عالیان کو تھپہ مارا۔" اصل بات تو اس نے اب کی تھی۔

ویرا نے ابرو اٹھا کر اسے دیکھا ہونٹ پر خال کے دھیر میں ہلکی بیٹھی تھی۔

"عالیان کامل سے گیا یہاں۔"

"میں نے اسے فون کیا مدد کے لیے اور فون کامل نے اٹھا لیا۔ میں کبھی دونوں نے مل کر میرے ساتھ یہ کیا ہے۔"

"کتنی ذہین ہو تم امجد۔ پہلے تم اتنی حواس پاخت ہو گئیں کہ اسٹور میں لاگ ہو گئیں پھر ایک دم سے تمہارا ذہن اتنا کلام کرنے لگا کہ تم نے وہاں ساری کھپائی سمجھ لی کہ کس نے کیا کیا کیا ہے۔ بے وقوف کی عقل ہمیشہ نقصان کے بعد حرکت میں آتی ہے۔ ہر بار۔"

اب تم عالیان سے سو رہی کر لیتے۔ مجھے تو آج شاپنگ کے لیے جانا ہے پھر مجھے اپنے نوڈ کے لیے کچھ تیاریاں کرنی ہے۔ کونو تمہیں بولی پھوٹاؤں؟"

"میں بس سے چلی جاؤں گی۔" اس نے اپنے نم گل صاف کیے۔

امت کر کے وہ اٹھی۔ تیار ہوئی۔ مدلی مدلی آنکھوں کے گرد ہلکے میک اپ کی۔ جمائی اور ہونٹ آگئی۔ وہ ابھی بھی یہ سوچ کر دہل سی جاتی تھی کہ اگر اسے اسٹور میں لاگ کیا جانا صرف ایک مذاق ہے۔ صرف اسے شک کیا جانا نہ ہوتا تو؟

یہ اتفاق تھا یا وہ شخص اس کے پیچھے ہی تھا۔ ہونٹ میں داخل ہوتے ہی اس نے کامل کو اپنے ساتھ چلتے ہوئے پایا۔

"گڈ مارننگ جنگل کوئین؟"

"تمہیں اس سے کیا؟" اس نے پھر سے نم آنکھیں رگڑیں۔

"دونا تمہیں ہر مسئلے کا حل لگتا ہے۔" ویرا فحش سے ہولی۔

"میں نے تم سے صرف مذاق کیا تھا اور تمہیں ہارٹ راک کے اس جیسے میں لے جا کر بٹھا دیا تھا۔ ورنہ میرا راز صرف تمہیں ہارٹ راک کو اندر سے دکھانے کا تھا۔ میں صرف تھوڑی سی ویر کے لیے وہاں سے غائب ہوئی تھی۔ وہاں بہت سے اہلکارے پونچھ رہے تھے۔ ایسی کوئی گھبراہٹ کی بات تو نہیں تھی۔ میں واپس آئی تو تم وہاں نہیں تھیں۔"

"میں تمہیں فون کر رہی تھی۔"

"معلوم ہے مجھے۔ میں فون رہی تھی کہ تم اتنی جلدی گھبرا گئی ہو کہ۔" میں گھبرا نہیں گئی تھی۔ میں بے حد خوف زدہ ہو چکی تھی۔ کیونکہ میں اس کیفے کے اسٹور میں بند تھی۔

"کیا کا تم نے؟" ویرا کو لگا وہ مذاق کر رہی ہے۔

"میں کیسے نیچے کیفے کے اسٹور میں بند تھی۔ اس ہارڈیڈر نے مجھے لاگ کیا تھا۔"

"کامل نے؟" ویرا بری طرح سے چوہ گی۔

"لوہ۔ تم نے اسے کچھ کہا تھا کیا؟ وہ ایسے ہی بھڑک اٹھتا ہے۔"

"تم جانتی ہو اسے؟" امجد ویرا سے فضا چوہ گی۔

"ہونٹ میں کافی چٹا جاتا ہے اسے۔ اس بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے۔ میں نے تمہارے ساتھ مذاق کیا اس کے لیے میں معذرت چاہتی ہوں لیکن امجد! تم وہاں دس منٹ بھی بیٹھی کیوں نہیں نکلیں۔ تم اتنی حواس پاخت کیوں ہو جاتی ہو؟"

"کیونکہ میں تم سب جیسی غدر نہیں ہوں۔"

رندھے گلے کے ساتھ وہ چلائی۔

"تو ہو جاؤ۔ ہم جیسی ہو جاؤ۔ تم اتنی بڑی ہو چکی ہو تو اب بڑی بن کیوں نہیں جاتیں۔ تمہیں کیسے اسٹور میں لاگ کر دیا گیا؟"

"تم تیز میوزک تھا اور وہ سب لوگ۔ اگر کوئی



امرد نے اسے مکمل نظر انداز کیا اور بزنس اسکول کی طرف چلنے لگی۔

"مجھے نفوس ہے کہ میں تمہیں زیادہ دیر تک اسٹور میں نہیں رکھ سکتا مجھے ڈر تھا کہ تم پولیس کو فون کر سکتی۔"

امرد کو السوس ہوا اسے کر لینا چاہیے تھا۔  
"وہی تم کو بھی لیتیں تو تم کبھی یہ ثابت نہیں کر سکتی تھیں کہ میں تمہیں وہاں تک لے گیا تھا بلکہ لٹا میں تم پر یہ الزام ثابت کر سکتا تھا کہ تم چوری کی غرض سے وہاں گئیں اور انجانے میں لاک ہو گئیں۔"  
ایک دم۔۔۔ کہیں سے نکل کر عالیان نے اسے اپہنچ کیا۔ کامل مسکراتا ہوا کھسک گیا۔

"مکمل کیا کہہ رہا تھا تم سے؟"  
"میں نے سنا مناسب نہیں سمجھا۔"  
"وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا" بے فکر رہو۔ وہ تھوڑا شرارتی ہے۔ یونی کا کوئی اسٹوڈنٹ کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا کہ اسے یونی سے نکال دیا جائے اس کا مسئلہ مجھ سے تھا۔ تم سے نہیں۔"  
"مجھے اس کے بارے میں بات نہیں کرنی۔ میں نے آج تک کبھی کسی کو ایسے ہٹ نہیں کیا۔" بہت کر کے اس نے جلدی سے کہہ دیا۔

"مطلب وہ خوش نصیب صرف میں ہی ہوں۔"  
"میں تم سے شرمندہ ہوں۔"

عالیان نے اس کی سرخی مائل آنکھوں کی طرف دیکھا۔ وہ جب جب ان آنکھوں کی طرف دیکھتا تھا اسے لگتا تھا کہ جیسے یس ابھی ان میں سے آنسوؤں کا دریا نکلے گا اور سب بھگ بھگ جائے گا۔  
"تم شرمندہ نظر تو نہیں آ رہے۔"

"کسے نظر آیا جاتا ہے شرمندہ؟" یعنی معافی بھی وہ مانگنے آئی تھی اور غصہ بھی وہی کر رہی تھی۔  
"دل۔ ایسے تو نہیں جیسے تم ہو۔"

"ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں۔" وہ معافی مانگنے آئی تھی تو بدلے میں یہ سننے لگی تھی کہ "کوئی بات نہیں" غلط فہمی ہو جاتی ہے، غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔

و غیر وہ غیور۔ لیکن وہ تو۔۔۔

"تم اتنی جلدی جلدی مداخلت کیوں ہوتی ہو؟"

وہ خاموش رہی۔  
"اچھا شہو۔ لو ہر مجھ کو تمہیں سوری کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔"

وہ اسے دیکھنے لگی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں، منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ پھر آنکھیں کھولیں، پین پر پھونک ماری اور پین کو جادو کی چھتری کی طرح گول گول کھما دیا۔

"یہ کیا ہے؟"  
"جلو۔ لب پھر سے سب پہلے جیسا ہو گیا ہے۔ میں نے وقت پر اپنا جادو چلا دیا ہے اس نے کل کی رات کو ہماری زندگی میں سے نکل دیا ہے۔ لب سب ٹھیک ہے سب ٹھیک ہی رہے گا۔"

امرد کو ہنسی آئی۔ "تم سب اتنے عجیب و غریب کیوں ہو؟"

"کوئی تم اتنی سمجھ دار کیوں ہو؟" اس نے ہاتھ میں پکڑے جلو کے چین کو اپنی ناک پر رکھتے ہوئے پوچھا۔  
"ہم سب باہم کھاتے ہیں نہ ہم سب مجھ دار" عقل مند، سسی والے انسان ہیں۔ "کیا اتر اہٹ تھی امرد کی۔"

"ہم سب بلیاں اور چوہے کھاتے ہیں" اسی لیے اتنے عجیب و غریب ہیں۔"

"بلی، چوہے، خرچ۔" امرد اپنی اتر اہٹ جھٹ بھول گئی۔ عالیان نے خواہش کی کہ کاش اس کے ہاتھ میں پکڑا چین واقعی جلو کا ہوتا، وہ اس کے "خرچ" کو ہمیں روک لیتا۔ امرد کو فریز کر دیتا۔ پھر اس کی ناک کو پکڑ کر دوائیں بائیں کرتا۔ کاش یہ جادو اسے آسک۔  
"پھر سے کرنا۔"

"کیا۔"  
"وہی جو بلی، چوہے کے پھر کیا تھا۔"  
"نہ تم سب باطل ہو۔" کہتے امرد جانے لگی۔  
"تم نے کبھی کسی کو خطبہ کیا ہے؟" وہ بھاگ کر اس کے پیچھے تیا۔



”نہیں۔“ ”دک مٹی۔“  
 ”میں تمہیں کہوں؟“ ”تنگو کو لہا کر رہا تھا لادقت  
 کہ“  
 ”امرد نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دکھا کیا چاہتے  
 ہو؟“  
 ”Do or Die“  
 ”اب یہ کون سا نیا نکل بن ہے۔“  
 ”ہم سب دست کرتے ہیں۔ سارا ماہی جھڑکنا  
 ہے۔“  
 ”سب کریک ہو گیا؟“  
 ”کریک؟“ ”اے تم چاہو تو میں تمہیں کوئی آسان سا  
 ٹمک دے سکتا ہوں۔“ ”سواننگ“ ”رنگ“  
 ”سائیکلنگ“ ”کچھ بھی لور خطر بھی۔“ ”امرد خاموشی  
 سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔“ ”ویسے تم بیٹھ ایسا  
 باتیں کرتے ہو؟“  
 ”آجھی ہیں نامیری باتیں۔ ویسے تم ڈر رہی ہو؟“  
 ”جی۔“  
 ”تم بے وقوف ہو۔“ ”امرد استنہز ایسے نہیں۔“  
 ”تم خوف زدہ ہو۔“ ”نہ بھی استنہز ایسے ہی ہوتا۔“  
 ”پہلے اپنا علاج کرواؤ۔“  
 ”ڈر کا کوئی علاج نہیں۔“  
 ”میں لوٹ پناہگ حرکتیں نہیں کرتی۔“  
 ”ایسے لوگ خوف کو کلی نام دے دیتے ہیں۔“  
 ”تم بہت زیادہ سگی ہو۔“ ”دھڑکنے لگی مطلب جاؤ۔“  
 ”نہ سہول کو الزام دیتے ہیں؟“ ”اس کے ساتھ  
 چلنے کا مطلب نہیں۔“  
 ”لوہ خدایا! تم لوگ۔ تمہاری تیز مرچ بھی  
 زبان۔“  
 ”انہیں جلدی غصہ آ جاتا ہے۔“  
 ”خدا کے لیے بس کرو۔“  
 ”وہ واسطہ دینے پر آ جاتے ہیں۔“  
 ”کیا چیلنج ہے تمہارا؟“  
 ”پکا۔“  
 ”نہ جلدی پھیل جاتے ہیں۔“ ”امرد کا قہقہہ بلند  
 ہانگ تھا۔“  
 ”عالمان کا جادو کاہن آخر کام کیوں نہیں کرتے۔“  
 ”یہ سواننگ“ ”سائیکلنگ“ ”وغیرہ مجھے نہیں آتی“  
 ”تم کچھ لور کہو۔“  
 ”یعنی آسان سا؟“ ”اب اسے چڑا رہا تھا۔“  
 ”جو مجھے آتا ہو لور میں کر سکوں۔“  
 ”یہاں قہیبی Dog Bowl ہے۔“  
 ”مجھے نہیں کرنا کچھ ڈو گنڈو فیما کے ساتھ۔“  
 ”یہاں ڈو گنڈو نہیں ہیں“ ”ایک گیند ہے“ ”بول ہے“  
 ”تمہیں گیند سے بول توں کو کرانا ہو گا۔ تم تین بار  
 ریکش کر سکتی ہو پھر تمہیں گیند سے ساری بول توں کو  
 کرانا ہو گا۔ ویسے میں نے لالک میں اتنا آسان چیلنج  
 کسی کو نہیں دیا۔ تم مشق سے ہوتے۔“  
 ”امرد سوچنے لگی۔“ ”ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔“  
 ”مشق دالے سب کر سکتے ہیں۔“  
 ”دسی ٹائیگر کو ساتھ لاؤ گی۔“  
 ”پاکل ضرور۔“  
 ”ٹشو ذرا۔“ ”پہلے یہ بتاؤ کن دنوں میں تیار ہوتی  
 ہے سیزن کیا میں اس کے کلا چار ہونے کے؟“  
 ”نہ ہمیشہ چاق و چوبند رہتی ہے۔“  
 ”اسے ضروری کام کب کب ہوتے ہیں۔“  
 ”میرے لیے نہ ہمیشہ فاسٹر رہتی ہے۔“  
 ”تم دنوں میں کپٹ فائٹ کب کب ہوتی ہے۔“  
 ”ہم میں بہت اچھی ذہنی آہنگی ہے۔ ایک اچھی  
 لڑکی ہے۔“  
 ”نہ کب تک بڑی بن جائے گی۔“  
 ”آہ۔“  
 ”اچھا۔ اچھا۔ آ جاتا دنوں۔“  
 ”لیکن دیر اس کے ساتھ نہیں آسکی۔ اسے نوز بہر  
 کے آفس جانا تھا۔ لیکن اس نے امرد کو بڑی درنگ کر  
 یہ سمجھا دیا تھا کہ گیند کو کس طرح سے ہاتھ میں پکڑنا  
 ہے لور کیسے ٹھیک سے پھینکنا ہے۔“  
 Dog Bowl میں یونورشی اسٹوڈنٹس کا  
 کافی رش تھا۔ امرد نے اپنی پریکٹس شروع کی۔ اس



بھنویں تن گئیں۔  
”پھر سب جھوٹ گئے گلتا ہے۔“ کالی آنکھیں  
جھلک کر نے لگیں۔

”تم ایک بار پھر کرو۔“  
”پھر ہارنے والے ہمارے بیٹے ہیں۔“  
”تم نے ضرور چھٹنگ کی ہے۔“  
”پھر، قاتل قاتل چلاتے ہیں۔“

”تم۔“  
”میں۔“  
”تم۔“

”میں دغا ہوں۔ مجھے جیت چلنے والے کہا جاتا  
ہے۔“

”تم نے میرا نقصان کر دیا۔ مجھے یقین تھا تم ہار جاؤ  
گی، پھر میں تمہیں سزا دیتا۔“ کتنا رحم طے انسان تھا۔ وہ  
اسے سزا دینے کے چکر میں تھا۔  
”کیسی سزا؟“

”میں تمہیں باتیں سناتا ہوں۔“  
”باتیں۔ یہ کیسی سزا ہے؟“

”یہ سزا سننے والے کے لیے ہوتی ہے بوٹے والے  
کے لیے نہیں۔ تمہیں سب سنا پڑتا ہے۔ وہ رومن  
اکھاڑے کے قصبے ہوتے یا اسکول کے دلوں کی  
سزائیں۔ وغیرہ شاپنگ کی فضول تفصیلات ہوتیں یا  
سب ویز میں ملنے والے سیپوں کی عجیب و غریب  
حرکتیں۔ بولنے والے کا جب تک جی چاہے گا وہ  
بولے گا۔ سارا دن رات۔ اگلا دن۔ اگلی  
رات۔ سننے والے کو سننا ہو گا۔ بولنے والے پر کم  
نی قسمت اتنی صبر ہوتی ہے تاکہ اسے ایسا سننے والا  
کوئی ملے؟“

”آئی دیر تک بولتے رہنے والا پاگل ہی ہو گا۔“  
”مجھے ہونا تھا نا پاگل۔“ اس کا شاید واقعے میں بڑا  
نقصان ہو چکا تھا۔

”اس سب کو چھوٹ۔ یعنی اب مجھے تمہیں چیلنج  
دیتا ہے۔ کوئی سزا ہے نہ۔“  
”ہاں۔ ایسا کرو مجھے کہہ دو کہ میں ابھی یہاں

نے کبھی یہ کھیل نہیں کھیلا تھا۔ گیند اسے ضرورت  
سے زیادہ دینی لگی۔ ویرا ٹھیک کہتی ہے۔ ایک انسان  
میں اتنی طاقت ہونی چاہیے کہ وہ ایک عام وزن کے  
انسان کو اٹھا کر پھینک سکے اور اس سے گیند نہیں  
اٹھائی جا رہی تھی، پاکستان میں انہیں ایک صوفہ یا ایسی  
ہی کوئی عام سی چیز اور سر سے ادھر کر لی پڑ جاتی تو وہ اتنی  
لوگ مل کر یہ سب کرتے اور پھر ایسے ہانپے لگتے جیسے  
کسی ہانسی کو گھسیٹتے رہے ہوں۔

پہلی کوشش میں اس کی گیند ایک بھی بوتل نہیں  
گرا سکی اور بوتلوں سے دھڑکن کے درمیان میں ہی  
کنارے پر جا کر رک گئی۔ دوسری کوشش میں اس  
نے کامیابی سے دو بوتلیں گرائیں اور تیسری میں پھر  
سے ایک بھی نہیں۔

”یہ تمہاری آخری کوشش ہے۔“ عالیان نے  
بہسی کو چھپا کر کہا۔

امرد نے اس کی بہسی دیکھ لی تھی اور وہ چڑھ گئی۔ اس  
بار اس نے گیند کو ایسے پکڑا جیسے میدان جنگ میں سپہ  
سالار بازی مات یا ہاتھ کے تحت تلوار کو باندھ کر تا ہے  
اور پوری قوت سے وار کرتا ہے۔ امرجہ نے مکمل قوت  
سے اپنی پوری قوت سے گیند کو پھینکا۔

لوہ پھر وہ ایسے چٹائی کہ آس پاس موجود ہمت  
سارے لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بھلے سے  
دیکھتے رہیں وہ چٹائی ہی رہی۔ ساری بوتلیں پت  
ہو چکی تھیں۔ مشی لڑکی امرجہ جیت چکی تھی۔

”تم نے تو کہا تھا تم نے یہ کھیل پہلے کبھی نہیں  
کھیلا؟“

”بے شک یہ پہلی بار ہے۔“  
”تم نے کسی بروڈیشٹل ٹی طرح گیند پھینکی۔ پہلے  
تم مجھے دکھانے کے لیے گیند کو ایویں لڑکھڑائی رہی  
ہوٹ۔“

”قسمت ساتھ ہو تو کوئی بازی مات نہیں ہوتی۔“  
اس نے ایسے کہا جیسے اس نے لہٹا اور لڈ کپ کی ٹرائی  
جیت لی ہو۔

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“ بھوری آنکھوں کی



"اب تمہارے گھر پر کبھی نہیں آئے ہو؟" میں نے  
 "میری دوست نے بھی ایک بار ایسے ہی کیا تھا۔ میں نے  
 وہ سو ایک گول گپے کھائے اور میں جیت گئی۔ بدلے  
 میں میں نے اسے بس لٹائی کما کر اسے صرف پانچ  
 منٹ تک اپنے ڈیڑی کی کار چلائی ہے۔"  
 "پس میں کیا مشکل تھا۔ یہ تو بہت آسان ہے۔"  
 "تم نے اسے آسان ٹھیک کہا۔"

"نہ کھانا نہیں چاہتی تھی۔"  
 "آں۔ لو۔ ڈاؤن کس بلڈ کی کار تھی؟"  
 "یہ تم لڑکے کے کار کے نام پر ماڈل پوچھنے کیوں بیٹھ  
 جاتے ہو۔ ایک کار تھی۔ بس۔ ایک  
 کار۔"

"یہ تم لڑکیوں کا لڑکیوں کے بلڈ پر دھیان کیوں  
 نہیں دیتیں۔ اتنی بات ہے۔"  
 "صرف چار منٹ کار چلا سکی۔ اگلے پانچ مہینے  
 کار در کشاپ میں رہی اور اس پر پورے پچاس ہزار  
 لگے۔ اور۔ بس۔"

"بس۔؟" عالیان نے ایسے پوچھا جیسے کہ رہا ہو  
 اتنے سب پر بھی ایسے بس کہہ رہی ہو۔

"ہاں۔ اور۔ اور۔ میرا داخلہ ان کے گھر  
 بند۔ بس۔"

"تمہارا داخلہ بند۔" اس نے گرجن کو بکا سا فلم  
 دے کر ہنسی کو ہونٹوں کے پیچھے روک کر پوچھا۔ اگر  
 اسے بے تحاشا ہنسی تو رہی تھی تو اسے کھل کر ہنس لینا  
 چاہیے تھا کیونکہ وہ بری طرح سے ناکام ہوئے نظر آ رہا  
 تھا اپنی ہنسی کو قابو میں رکھنے میں اس نے امرت سے  
 اپنا سر پھیر لیا اب اس کو شش میں تھا کہ وہ اتنی بری  
 طرح سے نہ ہنسنے کہ امرت براہن جانے لیکن ساری  
 کو شش بیکار تھی۔ اس نے سر کو اٹھایا پھر سر کے کھلے  
 آسمان کو دیکھا جس کے پیچھے وہ دلوں کھڑے تھے اور  
 خود کو بے قابو ہو جانے لگا۔

وہ ایک خوبصورت انسان تھا۔ ہنسنے ہوئے اچھا  
 لگتا تھا جیسے سب لگا کرتے ہیں۔ لیکن ایسے بے قابو  
 ہو کر ہنسنے وہ ایک عام نارمل انسان نہیں لگتا تھا۔

"گھنٹوں کے بل جھک جاؤں۔"  
 "تنی معمولی سزا۔ ہمیں کیوں کیوں یہ تم  
 سے۔؟"

"یہ معمولی نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔ ایسے نہ  
 کہو۔" اس نے ہنسی پھر لی طرح کر لیا جس کی جوہری  
 نے بہت کم قیمت لگادی ہو۔

امرد گہری سوج میں جلی "تم ایک ہفتے تک اپنی  
 کلاسز ٹیچ نہیں کرو گے۔"

"تم چاہتی ہو میں آج رات ہی خود کشی کر لوں۔؟"  
 "تو تم مرنا چاہتے ہو۔؟"

"میں مرناؤں گا اپنی کلاسز نہیں چھوڑوں گا۔  
 کچھ اور کہو۔"

وہ دلوں Dog Bowl سے باہر آچکے تھے اور  
 سڑک کے کنارے چل رہے تھے۔

"تم سسز ایگزٹرز نہیں دے گے؟"  
 "یعنی تم ہر صورت یہی چاہتی ہو کہ میں خود کشی  
 کر لوں۔"

"میں نے تمہارا پیچ پورا کیا۔ تمہیں بھی کتنا  
 چاہیے۔"

"کہتا تو ہے کر لوں گا خود کشی۔ اس سے بچھ کر اور  
 کیا ہو گا۔؟"

دلوں میں رہا پر آچکے تھے اور سڑک کے کنارے  
 چل رہے تھے۔ سڑک پر کئی رش تھا۔ لڑکے پونہ رشی  
 اسٹوڈنٹس کانی ہجوم تھا۔

"اچھا کچھ اور کہو۔"

امرد نے سڑک کی طرف دیکھا جہاں وہ کھڑے  
 تھے ٹاس سے چند قدم آگے نہیرا کراسنگ تھی جو کافی  
 طویل تھی۔ وہ دلوں بھی اٹھا بند ہونے کا انتظار  
 کر رہے تھے۔

"تمہیں بہت شوق ہے نا بندر کی طرح چھلانگیں  
 لگانے کا۔ تو تمہیں اس کراسنگ کو ہاتھوں کے بل  
 قہا لڑیں لگا کر اس کرنا ہے۔"

"پہلی فرصت میں اپنے بلڈ کا علاج کراؤ امرت۔ کہہ  
 کوں رہا تھا جس کا اپنا علاج ہونے والا تھا۔"



امرد کو لگا لگا مذاق کہتا ہے۔ یہ بھی فلاہادی نہیں کھائے گا کیونکہ اس نے مذاق میں کہا تھا۔ اصل میں وہ اسے حیز مزاج مسالے سے کئے توڑے کی چند پلیٹیں کھانا چاہتی تھی۔ اور وہ جانتی تھی کہ ایک پلیٹ سے زیادہ کھائی نہیں سکے گا۔ اسے اپنی زبان کو ٹوٹنی پڑ جائے گی۔ لیکن یہ فلاہادی لگا رہا تھا۔ اسے ایسا کرتے سڑک پر سے گزرتے یونیورسٹی اسٹوڈنٹس نے بھی دیکھا۔ وہ اتنا حیران نہیں تھے۔ کیونکہ اتنی بڑی یونیورسٹی اس طرح کے اگلے پلے اسٹوڈنٹس سے بھری پڑی تھی۔

پھول جوبل کی زمین سے پھوٹا ہے۔  
محبت کے مسالے میں دوامپا تہا ہے۔  
انسان دو حالوں میں اپنی جون بدل لیتا ہے۔  
ایک کرب کی حالت میں۔ دوسری محبت کی حالت میں۔

اور سڑک کے اس پار کھڑا عالمیان کرب کی حالت میں تو ہرگز نہیں تھا۔ اس کی جون بدل چکی تھی۔ اور یہ کام سڑک کے اس پار مشرق سے آئی۔ نئی دنیا کو حیرت سے دیکھتی لڑکی نے کیا تھا۔ باپسٹر کے کھلے آسمان تلے۔ دونوں اس اور اس پار کھڑے تھے۔ فاصلہ تھا۔ کم تھا۔ زیادہ بھی ہو سکتا تھا۔

\*\*\*

"Keep Calm and love Fridays"  
(پر سکون رہیں اور جمعوں سے محبت کریں) اور یورپین جمعوں سے اتنا پار کرتے ہیں کہ کہلیڈ ریسنورٹس ہوڈلز کافی شکلیں اور ایسی ہی دوسری جگہوں کے نام اولی گاڈ اس فرائیڈے وی لو فرائیڈینے یا ڈی فار فرائیڈے جیسے دیکھتے۔ اور اولی اونکی لوا فرائیڈے جیسے بھی۔

تو اولی گاڈ ناؤ کل ایز آر فرائیڈینے میرے خدا یا اب سب دن جیسے کے دن ہیں) کا موسم شروع تھا۔ موسم جس کا سارا سال انتظار کیا جاتا ہے۔ موسم جسے مسکراہٹوں کا طینن کا خوشیوں کا اور محبتوں کا موسم

امرد نے ہاتھ باندھ لیے اور اسے گھورنے لگی۔ لیکن کرس ایجنڈہ درجہ کی سی آنکھیں رکھنے والا بھی یہ نہیں دیکھ رہا تھا کہ کللی چلیوں والی وہ آنکھیں اسے تھا ہو کر گھور رہی ہیں۔ وہی آنکھیں جنہیں قرب سے دیکھتے وہ اپنی رات سے بہت دور چلا گیا تھا۔ یہ صرف عالمیان نہیں رہا تھا۔

بہتے بہتے وہ چند قدم آگے چلا جاتا بھی چند قدم پیچھے۔ اپنی آنکھوں کی کمی کو صاف کرتا اور امرد کو دیکھ کر کہتا۔

"اور بس۔ تمہارا داخلہ بند۔"

اس نے ایسا دو تین بار کیا۔ امرد شرمندہ سی ہو کر اس پاس دیکھنے لگی۔ اس میں اتنی کوئی چہرے کی بات نہیں تھی۔ اس کے کھلے بال ہلکی ہوا سے اڑ رہے تھے۔ اس نے مجھے سے ہاتھ کی ٹٹوں کو پیشانی سے پیچھے کیا اور پیش سے ہاتھ میں ہاتھ چلانے لگی۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی اسے لگ رہا تھا کہ وہ اس کی بے عزتی کر رہا ہے کیسے پاکلوں کی طرح جس رہا ہے۔ رونے کے لیے ہر وقت تیار رہنے والی امرد نے ایک اور بار رونے کی تیاری کر لی۔

کچھ ہی دیر میں جب بمشکل عالمیان خود پر قابو پا سکا تو اس نے امرد کے فیسے رونے پر تکان کھل کر غور کیا اور اسی وقت امرد تیزی سے اس کے آگے الگ سے چلنے لگی۔

"امرد۔" عالمیان اس کے پیچھے لگا لیکن وہ مجھے ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی۔ تیز تیز چلتی ہی جا رہی تھی۔ سمجھ گیا کہ وہ ایسے کیل جا رہی ہے۔  
"امرد۔" اوھر مجھے دیکھو۔ میں تمہارا چیلنج قبول کرتا ہوں۔"

امرد کو اپنے پیچھے حیز چلانے کی آواز آئی اس نے رک کر ڈراما پلیٹ گرد دیکھا۔ اشارہ بند ہو چکا تھا۔ ٹریفک رک چکی تھی۔ سڑک کو پار کرنے والے سڑک پار کر رہے تھے اور ان میں بزنس اسکول کا اسٹوڈنٹ عالمیان بار گریٹ ہاتھوں کو سڑک پر ٹکائے کی تیاری کر رہا تھا۔



کہا جاتا ہے۔ تحائف کا۔ سیاحت کا۔ اور گھنٹوں کا بھی۔

دنیا بھر کے رنگ برنگے پرندوں سے آباد ماچسٹر خالی ہوئے لگا۔ باہر دھیرے دھیرے تھوڑی تھوڑی تک کے لیے پونی بند تھی و تھوڑے درک پارک ہل اسٹوڈنٹس کی رہائش (Oak ہاؤس اور اس پاس کی دوسری اسٹوڈنٹس کی رہائش گاہیں خالی ہونے لگیں اور برطانیہ کے Stereotype موسم نے اپنے رنگ ڈھنگ دکھانے شروع کر دیئے۔

دوسرے فیسوں سے آئے اسٹوڈنٹس اپنے گھروں کو چلے گئے۔ دوسرے ملکوں سے آئے کچھ ماچسٹر میں جلب کی وجہ سے رہ گئے کچھ اپنے دوستوں کے ساتھ فن کے گھروں کو چلے گئے اور کچھ دوسرے ملکوں کی سیاحت کی تیاری کرنے لگے۔ پکاڈلی اسٹریٹ سے یونیورسٹی کیمپس تک آنے والی مفت بس سروس باندھنے لگی۔ امرد نے آکسفورڈ روڈ کو سنسان ہوتے دیکھا جہاں پر صبح اسٹوڈنٹس کا ہجوم تیزی سے حرکت کرتا نظر آیا کرتا تھا۔ امرد ایک دم سے سب کو دھکیلنے لگی تھی جنہیں وہ جانتی تھی اور جنہیں قطعاً نہیں جانتی تھی سب کو اتنے ہزاروں اسٹوڈنٹس کے ہم غنیمت کو اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس ماحول سے اتنی وابستہ ہو چکی ہے کہ اس ماحول کے بدل جانے سے ایسے لوگ ہو جائے گی۔ آکسفورڈ روڈ کو ایسے خالی خالی دیکھ کر اسے ہول پڑے۔ وہ اتنی جذباتی ہے۔ اسے اب معلوم ہو رہا تھا۔ پونی بند ہوتے ہی اسٹوڈنٹس بازاروں کی طرف بھاگے۔ ڈھیروں ڈھیر خریداری کرتے۔

اس کے اسٹور میں سپرسل کی تیاری تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ اب ایک پورا مہینہ وہ دن رات کام کر سکتی تھی ان کی لی گھنٹہ اجرت بھی بڑھادی تھی۔ وہ اتنے دنوں میں زیادہ سے زیادہ دنوں کے لیے کالی پونڈز کما سکتے تھے اور امرد یہ پونڈز کمانا چاہتی تھی۔ شراب خور و غیرہ کا گروپ یورپ کی سیاحت کے لیے جا رہا تھا۔ اور عالیان بھی۔ اسے حیرت تھی کہ

وہ دوسرے ملکوں میں اتنی آسانی سے گھومنے پھرنے کے لیے کیسے جاسکتے ہیں پاکستان میں تو لوگ ایسے دوسرے فیسوں میں نہیں جاتے۔ وائٹ نے اسے بھی چلنے کے لیے کہا تھا، لیکن اس نے انکار کر دیا تھا۔ اسے ایک ایک پونڈ جمع کرنا تھا۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو اتنے پیسے نہیں لگتے جتنے تم سمجھ رہی ہو۔ ہم ٹرین یا بس سے جائیں گے ہم نے خاص ڈسکاؤنٹس پاس لیے ہیں جن سے ہمارے بہت کم پیسے خرچ ہوں گے۔ ہم کسی لکڑی ہوٹل میں نہیں رہیں گے بلکہ ہوٹلوں میں رہیں گے یا بہت کم قیمت والے ہوٹلوں میں۔" شراب نے اسے حائل کیا۔

"میں پھر بھی نہیں جاسکتی مجھے ایک ایک پونڈ بچانا ہے۔"

"ٹھیک ہے تمہارا ایلہ بھی معقول ہے۔" ہم پہلے سوچیں جاتیں گے پھر فرانس۔ کیا کوئی ایسا جوتے ہیں جو پیروں کو اتنا آرام دیں کہ لگے ہی نہ ہوں؟ ہم انہیں پسینہ کر آتھے اس میل چلتے رہیں گے۔ جلنے سے پہلے رات کو عالیان اس کے اسٹور آیا۔ "میں مل رہا ہوں جوتے نہیں۔"

"جوتوں کی دکان میں کام تو کرتی ہونا۔؟"

"میں سیلزمن نہیں ہوں۔ تم سیلزمن کے پاس جاؤ۔"

"مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم نے صبح سے اب کم از کم سے دس کپ کڑوی کافی کے پیے ہیں۔ زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔"

"کافی کڑوی ہی ہوتی ہے۔" مکتوثر برر کے کہنے پر کے ساتھ وہ مصروف تھی اور ایسے ظاہر کر رہی تھی جیسے اتنے بڑے اسٹور کا کام وہ اکیلی ہی کرتی ہے۔

"کافی اس وقت کڑوی ہوتی ہے جب وہ زبان کو بھی کڑوا کر دے۔"

"شاید تم سیاحت کر کے واپس آؤ تو ایسی کم عتیقی کی باتیں کرنا چھوڑو سنا ہے دوسری سرزمینوں کا پانی پینے سے لور فضا میں سانس لینے سے بہت سی مائی بیماریاں ٹھیک ہو جاتی ہیں۔"



ہو کہ خدا کے لیے جلا میرا ملو نہ کھانا۔  
 "ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں۔ لیکن "فرسور  
 ہے تم مجھے فون کر کے بتا سکتی ہو۔ ہمیں صبح لکنا  
 ہے۔ تم ہمارے لکھنے سے ایک منٹ پہلے بھی بتا سکتی  
 ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میرا دل ہوا تو میں ایک منٹ پہلے  
 فون کروں گی۔"  
 "ہاں ہاں۔"

وہ جا رہے تھے صرف دیکھ کر قہقہہ ہونے لگتا۔ مزید  
 اسٹور میں گزار کر وہ چلا گیا۔ امرت کی آنکھیں نم  
 ہو گئیں۔ دیر اور ابن امان بھی جا چکے تھے جتنے اس  
 کے دوست تھے لور جن جن سے اس کی ہائے پہلو تھی  
 سب باری باری چائے تھے۔ وہ بھی جانا چاہتی تھی  
 بلکہ وہی تو جانا چاہتی تھی۔ وہ جس نے کبھی یہ نہیں  
 سوچا تھا کہ وہ بھی پاکستان کے چند شہروں کے علاوہ کہیں  
 اور گھوم پھر سکے گی اس کو تو جانا چاہیے تھا۔ دیر ابن  
 امان لور ایسے ہی دوسرے لوگ کہنے کہنے ملک گھوم پھر  
 چکے تھے یہ لوگ سارا سال کام کرتے اور ان دنوں میں  
 سیاحت کے لیے نکل کھڑے ہوتے۔ اس نے بھی کام  
 کر کے پیسے اکٹھے کیے تھے لیکن وہ پیسے وہاں کو واپس  
 کرنے کے لیے جمع کر رہی تھی۔ اگر بلا کی دکان میں  
 آگ نہ لگتی لور اس نے اپنے پیسے دلو اکونڈے دے دیے  
 ہوتے تو وہ بھی دیر کے ساتھ نکل چکی ہوتی۔ اس کی  
 آنکھیں نم تھیں اس لیے کیونکہ زندگی شاید اسے چند  
 مواقع دے دے گی دوسرے ملکوں کی سیاحت کے  
 لیکن وہاں سے یہ سب دوست شاید نہیں دے سکے گی۔  
 خیر دل کو مضبوط کرتے۔ اور نام کرتی رہی اور ہنسنے  
 میں ایک بار یونیورسٹی تک پیدل چلتی ضرور جاتی۔  
 خوش آئند بات یہ تھی کہ قہقہہ جنوری سے سب پہلے  
 جیسا ہونے والا تھا۔ یونی کھلتے ہی انگیزا مڑ شروع تھے  
 اس لیے سب نیا ایر کے بعد کتا شروع ہو جائیں گے۔  
 یونیورسٹی کے ہزاروں اسٹوڈنٹس کو کبھی یہ خبر نہیں  
 ہو سکتی تھی کہ لہور کی رہنے والی۔ دادا کی گود میں

"لگتا ہے تم پر کام کا بہت بوجھ ہے امرت۔" اس  
 نے انداز کو افسوسہ بنایا۔

"میں مضبوط اعصاب کی مالک ہوں۔" امرت نے  
 انداز کو مضبوط بنایا۔

"لیکن تمہاری شکل کچھ اور ہے کہ رہی ہے اگر تم  
 کہو تو میں سوئڈن چلا جاتا ہوں فرانس نہیں۔ بلکہ اگر  
 تم کہو تو میں جانا ہی نہیں۔ میرا خیال ہے میرے  
 جانے سے پہلے ہی تم مجھے بہت مس کرنے لگی  
 ہو۔"

"مجھے انتظار رہے گا یہ دیکھنے کے لیے سوئڈن  
 فرانس کی ہواؤں نے تم پر سے پاگل پن کے اثرات  
 کچھ کم کیے یا اور بڑھا دیے۔"

"تمہیں میرا انتظار نہیں رہے گا۔" اس نے چند  
 قدم آگے بڑھ کر جوتوں کے دیک کی طرف دیکھتے ہوئے  
 خود کو لاپرواہ ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

امرت خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔  
 "تو میں جا رہا ہوں۔" اس نے کہا تو لیکن وہ جانے  
 کے لیے اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

"مہر اس نے ایک سیلزمین کو حجب کیا۔  
 "میں ایسے جوتے چاہیں جنہیں پس کر یہ او  
 سکیں سیلزمین کی بند کریں۔"

عالیان نے چونک کر امرت کی طرف دیکھا۔  
 شرارت سے مسکرا رہی تھی۔  
 "یہ جوتوں کی دکان ہے بیک ٹوڈی بیوچ فلم کا سیٹ  
 نہیں۔ یہاں کچھ الٹے نشوونے والا نہیں ملتا۔" مہر پر  
 کام کا کل بوجھ لگتا تھا۔

"تمہارے اس سیلزمین نے بھی کڑی کٹلی پی ہے  
 اور وہ کپ سے زیادہ پی ہے۔" منہ بسور تا عالیان چلا  
 گیا۔ پانچ منٹ بعد وہ پھر سے اس کے پاس موجود تھا۔

"میں نے کچھ پیسے جمع کیے ہیں تم مجھ سے ادھار  
 لے سکتی ہو اور ان کی واپسی کی کوئی جلدی نہیں۔  
 جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو ہم حساب ٹھیک  
 کر لیں گے۔"

امرت نے اپنے سر پر ایسے ہاتھ رکھ لیا جیسے کہ رہی



شہر ہونے والا میلہ سو سے زائد اسٹار کے ساتھ شی  
سینٹر میں سج چکا تھا جہاں راتیں جگمگ کرتی تھیں  
اور دن قلعاریاں بھرتے تھے۔ جہاں رکھی سیل کی  
چمک گدگدی کرتی تھیں کہ آخر مجھے اٹھا کر اپنے نرم  
گرم گھروں میں کیوں نہیں لے جاتے۔ زیادہ جھنجھکی تو  
نہیں ہے ہم۔

کام کی زیادتی نے اسے تھکا ڈالا تھا۔ مل بناتے  
بناتے اس کی انگلیاں نوٹنے جیسے ہو جاتی تھیں۔ برگر کو  
کافی کے ساتھ بمشکل اندر کر لیتی تھی۔ گھر جا کر چند گھنٹے  
سولی لور پھر سے کام پر آ جاتی۔ دلوا سے بات ناممکن  
ہو گئی تھی۔

”کتنی کمزور ہو گئی ہو تم؟“ دلوا سے کافی دلوں بعد  
بات ہوئی تو دلوا اس ہو گئے۔

”نہیں تمہارے باب کو دکھانا ہوں تمہاری یہ  
حالت۔“ دلوا سے تم کتنے گھنٹے روز کام کرتی ہو۔  
جتنے بے تم ہاں اتنی محنت کر کے کمادی ہو اس سے  
لوں پیسے یہ لوگ اپنی فضول خرچیوں میں اڑا دیتے ہیں  
وہ کام والیاں آتی ہیں گھر تمہاری ماں سے کہا کہ ایک گھر  
فابریک کرو پیسے پہلو لیکن کہیں سنا ایک گھر کے کام ہی  
کتنے ہوتے ہیں امرد۔! جہاں تم رہتی ہو وہاں بھی تو  
لوگ کام والیوں کے بغیر رہتے ہی ہیں اور وہ کھو کتنے  
کامیاب تر بن جاتے ہیں۔ ہم سے تو بحیثیت قوم آگے  
ہی ہیں۔“

وہ خاموشی سے دادا کو سختی ری کیا کہتی۔  
اگلے دن بابا کا فون آگیا ”چھوڑو جاب۔ میں جیسے  
تیسے کر کے تمہیں پیسے بھیج دوں گا۔ اب حالات پٹنے  
سے بہتر ہیں۔“

”نہیں بابا مجھے عادت نہیں ہے۔ اس لیے تھک  
جاتی ہوں جب عادت ہو جائے گی تو سب ٹھیک  
ہو جائے گا۔“

”تمہیں کوئی خاندان نہیں پانا کہ تم ایک ایک  
روپے کے لیے ایسے پریشان ہو۔“

”مجھے خود کو پانا ہے بابا۔ مجھے خود کو مضبوط کرنا  
ہے۔ میں اب تک مضبوط نہیں ہو سکی تو اس میں

گھنٹوں سر رکھ کر دو نے دلی ان سب کو کتنا یاد کر رہی  
ہے۔ وہ یونیورسٹی پر گرنے والی برف کو گھورتی ہے لور  
مسکراتے کی سنی کرتی ہے۔ وہ اولڈ کیمپس کی  
یونیورسٹی تو ک کے پاس آکر گھڑی ہو جاتی ہے اور آتی  
جاتی ٹریفک کو دیکھتی ہے۔ اس کے منہ سے بھاپ نکلتی  
ہے اور آنکھیں کیلی کیلی ہو جاتی ہیں۔ وہ دادا کو  
ماچسز میں پھیل برف دکھاتی ہے۔ مسکراتے کی  
کوشش کرتی ہے۔ ان سے باتوں میں دل بھلائی  
ہے۔

”تم چلی جاتیں میری بچی۔ جتنے پیسے تمہارے  
پاس تھے۔ پیسے تو آجائیں گے وقت نہیں آئے گا۔“  
”میں اگلے سال چلی جاؤں گی۔ اگلے سال تک تو  
میں یہیں ہوں نا۔“ اس نے دادا سے کہا اور خود کو بھی  
نسل دی۔

”زندگی نے جتنے بھولے اپنی بانہوں میں تمام  
رکھے ہیں وہ سب وقت کے اشارے سے چلتے ہیں۔  
ان میں بھولنے کے لیے وقت کے اشارے کا انتظار  
کرنا ہی پڑتا ہے۔“

\*\*\*

لور کہا جاتا ہے کہ  
کہ کیا پیاری چیز ہے کرسمس کینڈل  
نہیں کرتی شور و غوغا...  
لیکن نرمی سے خود کو فحش اور کرتی ہے  
بے غرضی سے۔ یہ ختم ہو چکی جاتی ہے  
اور یہ بھی تو کہا جاتا ہے کہ جب کرسمس آتا ہے تو  
گھر کی یاد ستاتی ہے حتیٰ کہ آپ گھر میں ہی ہوتے  
ہیں۔“

سارا ماچسٹ۔ اور سارا ایرطانیہ۔ لور سارے کا  
سارا اور ب کرسمس فلو کا شکار ہو چکا تھا کوئی چھینکتا ہوا  
نظر نہیں آتا تھا لیکن مسکراتا ہوا ضرور آتا تھا۔ شی  
سینٹر کرسمس مارکیٹ میں اونچے ستون پر بہت بڑے  
سے سانا کلاز کو بٹھا دیا گیا تھا جو پلین پائونڈز مسکراہٹ  
سب پر فحش اور کرتا تھا۔ کرسمس کے بڑے میلوں میں



”میرے قادر امریکا سے یہاں کلاس کے لیے آئے  
تھیں دس سال تک انہوں نے گاڑیوں کی ایک فیکٹری  
کی مشینوں کی صفائی کا کام کیا ہے ان کے جسم سے  
مستقل کیمیکل کی بو آتے گی تھی ان کا کہنا ہے کہ ان  
دس سال میں انہوں نے اپنی سگریٹ پینے کی خواہش  
کو دبائے رکھا اور ایک سگریٹ کی ڈسہ جب انہیں  
تھپے میں ملی تو انہوں نے اسے جلا دیا کہ اگر انہوں نے  
وہ ڈلی لی لی تو دس سالوں میں کھائے گئے سارے پوٹو  
دھو میں کی نذر ہو جائیں گے جس کے قادر کا ایسا ماضی  
رہا ہو اس کے بیٹے پر یہ سوٹ نہیں کرنا کہ وہ پچھتر  
جیسی بڑی پونی میں بڑھے بھی اور باپ کی کمائی پر ایسے  
میش بھی کرے اسکول کی چھٹیوں میں انہیں نے اسی  
ریٹورنٹ میں کام کیا ہے ایک بار میں نے فیسے میں  
اسٹاف کے ایک ورکر کو دھکا دے دیا تھا مجھے اسی  
وقت جاب سے نکل دیا گیا تھا اب میں ڈاکو منتر بن کر  
اپنا خرچ نکالتا ہوں۔“

”آخر والدین اپنی اولاد کے لیے ہی کھاتے ہیں۔“  
”ہاں تو میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں جس بہت کھلی ان کی  
کمائی اگر سارے والدین صرف اولاد کا ہی سوچتے  
رہیں گے تو انسانیت کا کون سوچے گا۔“  
”انسانیت کا؟“ ایک ہزار ایک اور سوال امر کے  
ذہن میں اس بات کو سن کر بننے لگے تھے  
”ہاں۔ اگر وہ لوگ ساری زندگی کما کما کر صرف  
اپنی اولاد کا ہی سوچتے رہیں گے تو کل انسانیت کے  
بارے میں کون سوچے گا۔ ہمیں اپنی زندگی کے  
دائرے اتنے محدود نہیں کر لینے چاہئیں کہ ہماری  
ساری زندگی کا حاصل صرف چند افراد کو ہی قائم  
رہے۔“

امرد ڈیرک کے اس جواب کو اچھی طرح سے  
سمجھ چکی تھی اسی لیے اگلا سوال نہیں کر سکی۔  
”جواب ہو چکی تھی۔“  
”کرشمس سے ایک دن پہلے وہ سادھنا کے ساتھ  
کرشمس مارکیٹ گئی اور دونوں نے لیڈی مہر کی قتالی  
ڈھیروں ڈھیر خریداری کی انہوں نے اپنے سب بچوں

میرا تصور ہے“ آپ کا ہے۔ ہمارے نظام کا ہے۔  
آپ پریشان نہ ہوں۔ میرے جیسی بہت سی لڑکیاں  
مجھ سے زیادہ سخت کام کر رہی ہیں۔ میری تو جاب ہی  
بہت آسان ہے۔ آپ حملو تھی اور وہاں کی طرف  
توجہ دیں۔ میرا دل چاہتا ہے وہ سڑکوں کی طرح وہ بھی  
زندگی میں آگے بڑھیں۔ محنت کریں اور کامیاب  
ہوں۔“

پاپا نے اس کے اکاؤنٹ میں تھوڑے پیسے ٹرانسفر  
کر دیا یہ جنہیں اس نے ہاتھ بھی نہیں لگایا زندگی  
میں ملنے والے اسی آرام و آسائش نے اسے ایسا بنادیا  
تھا۔ ریڈی میڈ کھانا کھانے کو ملتا رہے تو خود کھانا پکانے  
کی زحمت کوئی بھی نہیں کرتا۔

ایک بار وہ ڈیرک کے ساتھ Dranson مٹی  
تھی ان دونوں کی مٹی ڈاکو منتری کو لے کر ان کی ایک  
نمائندے سے ملاقات ملے تھی۔ ملاقات کے بعد  
جب نما کنندہ چلا گیا اور مل گیا تو ڈیرک نے دوسرے کما  
کہ وہ اس مل کو آفس میں بھجوا دے۔ مل کے نیچے  
ڈیرک نے سائن کر دیے تھے۔  
”کس کے آفس؟“

ڈیرک ہنسنے لگا۔ ”میرے پاپا کے آفس۔“  
”مل اتنی دور ان کے آفس جائے گا۔ تھوڑے  
سے پیسے ہیں۔ میں بے کردتی ہوں۔“  
”میرے پاپا کا آفس ہمیں اسی ریٹورنٹ میں ہے  
Dranson کے تیسرے حصے دار ہیں۔“

”تمہارے پاپا یہاں کے تیسرے حصے دار ہیں تو دوسرے  
حصے میں کیوں رہتا ہے؟“  
”نن لیکٹ مجھے مفتی سے منع کیا گیا ہے کہ میں  
یہاں نہ گیا کروں۔ میں یہاں تب آتا ہوں جب  
بالکل خلل جیب ہو چکا ہوتا ہوں۔ کبھی کبھار زیادہ نہیں  
مل پر میں سائن کرتا ہوں اور جب میرے پاس پیسے  
ہوتے ہیں میں یہاں آکر پے کر جاتا ہوں۔ اتنی سی  
رعایت مجھے مل جاتی ہے۔“

”تم کہہ رہے ہو یہ تمہارے پاپا کا ریٹورنٹ ہے  
پھر بھی تمہارے ساتھ یہ سب؟“



کے لیے مخالف ملکوں کے لیے سہولت کے لیے ملے  
میں سہولت کی شادی بھی تھی کچھ اس سلسلے کی  
خریداری بھی کی۔

سلاخ کو گھر چھوڑ کر اپنی بیوی اپنی اور اگر لولہ  
کیسپس کی تورک کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ موسم کے  
تیز ہوجانے سے ہی بدل رہے تھے تیز ہوا چل رہی تھی اور  
بی بی سی نیوز نے برف باری کی خبر دی تھی وہ عمارت کی  
دیوار کے ساتھ تک کر کھڑی دھندلے آسمان کو دیکھ  
رہی تھی۔ دھند بڑھتی ہی جا رہی تھی اور کچھ دور آگے  
کی چیزیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اسے یہ سب اچھا  
لگ رہا تھا۔ اسے برف باری کا انتظار تھا اس کے پاس  
ایک گھنٹہ تھا پھر اسے واپس اپنی جگہ پر جانا تھا وہ اپنی  
بیوی کے آگے برف باری کو ہوتے دیکھنا چاہتی تھی ہوا  
اور تیز ہو گئی دھند اور بڑھنے لگی روٹی کے گالے مل  
کے چار کی طرح نرمی سے زمین پر برسنے لگے۔ ہوا اور  
تیز ہو گئی اور اس نے اپنے سرخ دستوں والے ہاتھوں کو  
پھیلا لیا۔ برف باری بلاشبہ وہ منظر ہے جو پہلی بار  
دیکھنے والوں کو متاثر سا کرتا ہے سفید پھول برف  
بنے اور اسے شراقتیں کرتے لگے تھیں اس وقت  
ہو رہی تھی دور دھند میں اس نے دیکھا کہ کوئی آ رہا  
ہے وہ عمارتیں تھیں قریب آیا اور دور ہو آچلا گیا۔

وہ عمارتیں نہیں تھیں  
بریلیے رہائشوں کو سمیٹتے اپنے سرخ دستوں پر  
اندازے وہ جہاں کی تھیں کھڑی رہ گئی۔  
"اسے عمارتیں آتا اور جانتا کیوں نظر آیا تھا؟"  
گرم کوٹ کے اندر اس کے وجود نے سسم کر جھری لی۔

دھند کو چیرتا پھر کوئی آ رہا تھا آسفورڈ روڈ کو بھاگ کر  
پار کرنا ہوا بیوی کی طرف بڑھتا ہوا اور عمارت کی  
دیوار کے ساتھ سمٹ سی گئی۔ برف باری میں تیزی  
آئی تھی۔ اس کے سرخ دستا نے خم ہو رہے تھے۔  
برف کی پھوار کو دیکھتے اس کی آنکھیں نہیں تھک رہی  
تھیں اور یہ کون اس کی طرف آ رہا تھا اس کے ہاتھ میں  
نیلے پیلے سفید پھول تھے۔ پھول بہت زیادہ تھے لیکن پر

برف گر کر جھری تھی۔ وہ بار بار انہیں جھاڑ رہا تھا۔  
اس نے گرہن کو گھمڑے کر اور دھند کو دیکھا اور ابھرا لپکا کر  
سکرایا۔

تیز ہوا کا جھوٹا آیا اور اس شبیہ کو اڑا کر لے گیا  
اور اس نے سسم کر اس پاس دیکھا ٹرک نہ ہونے  
کے برابر تھی اکا دکا لوگ بیٹھے بس اور اور اس نے وہاں  
سے تیز تیز بدول چٹنا شروع کر دیا۔ اس کا دل خوف  
سے سسم رہا تھا۔ وہ اور تیز چلنے لگی اور پھر وہ بھاگنے  
لگی۔ آسفورڈ روڈ پر بیوی کو اپنے پیچھے چھوڑ کر۔  
خوف اس کے وجود میں سرایت کر رہا تھا۔  
عمارتیں اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے ہر جگہ تھیں۔  
وہ سامنے سے اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ پیچھے سے اسے  
پکار رہا تھا۔

یہ سب کیا تھا۔ یہ سب ٹھیک نہیں تھا۔  
اسے اپنے تعاقب میں عمارتیں نہیں چاہیے تھیں۔  
برف پر بھاگتے بھاگتے وہ پھسل کر گر گئی۔ یہ عمارتیں کون  
تھا جس نے اسے گرا دیا تھا۔ گھنٹی ٹانگ سے درو کی لہر  
پھولی۔ اٹھ کر اس نے اپنے کپڑے جھاڑے۔ گردن  
سے لینے مفلر کو کھول کر اس نے اچھی طرح جھاڑا اور  
گرہن کے گرد پیٹ لیا۔ برف اس کے وجود میں با ترقی  
اسے گھنٹا کر رہی تھی۔

اور اسے تکلیف ہو رہی تھی۔  
سفید کے ماحول میں سرمئی کوٹ اور سرخ مفلر  
میں وہ خرابی میں کھلی اس گلی کی مانند تھی جو بدوقت  
کھلنے پر آبدیدہ ہو جاتی ہے۔

بیوی کو اپنے پیچھے چھوڑتے وہ آہستہ آہستہ چلی  
جا رہی تھی۔ روٹی کے گالے ابھی بھی گر رہے تھے۔  
اس کے کھلے بالوں میں ایک رہے تھے۔ وہ برف باری  
کو دیکھنے لگی تھی لیکن اس نے یہ کیسی برف باری  
دیکھی تھی۔ جس نے اس کے اندر کی ہماروں کو ختم کر  
ڈالا تھا۔ سارا سبز سفیدے میں بدلتا جا رہا تھا۔  
"اور خرابی کتنی بھی خوب صورت کیوں نہ ہو وہ  
ہمارے کو نکل لے تو موت ہوتی ہے۔"

(بالی آئینہ ماہانہ شاد آئینہ)





سمیرا حمید

## گلزار

امرد کی پیدائش کے وقت اتفاقی طور پر رونما ہونے والے چند ناگوار اور نقصان دہ واقعات کے سبب وہ اپنے خاندان میں ”منخوس“ مشہور ہو جاتی ہے۔ اس کے بابا اماں دادی اور بیٹیوں بہن بھائی دانیہ، حماد اور علی اسے اکثر جہنم جلی، منخوس، کالی نظر اور کالی زبان کہتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی منگنی بھی ان ہی افواہوں کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اپنی نحوست کے صبح شام قصے سن کر امرد خود ترسی کا شکار ہو کر رو رہی رہتی ہے۔

پورے گھر میں صرف دادا ہی اس کی دل جوئی کرتے ہیں اور گھر والوں کی باتوں کو لغو قرار دیتے ہوئے امرد کو بھی ان پر کان دھرنے سے منع کرتے ہیں۔ امرد کی اپنے دادا سے خوب ہنسی ہے۔ وہ سارا دن ان کے ساتھ پنجاب لا بیرری میں گزارتی ہے۔ جہاں وہ لا بیرری تھے دادا اسے سمجھاتے ہیں کہ تم بڑھائی پر دھیان دو اور اسکا لرشپ لے کر باہر ملک چلی جاؤ۔ امرد اپنے باقی بہن بھائیوں کی طرح بڑھائی میں کمزور ہے، مگر دادا کی بات پر وہ ٹاپ کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دیتی ہے، مگر پھر بھی بہت اچھے نمبر حاصل نہیں کر پاتی۔ اسی دوران اس کی شادی کا سلسلہ چلتا ہے، مگر پندرہ روز قبل دو لہما کی جوان بہن کے بیوہ ہو جانے پر اس کی شادی رہ جاتی ہے اور اس کی نحوست پر ٹھہر لگ جاتا ہے۔ امرد دل برداشتہ ہو کر نیند کی گولیاں کھا کر خود کشی کی کوشش کرتی ہے، تاہم بچ جاتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد امرد کی زندگی مزید تنہا ہو جاتی ہے۔ وہ مختلف پیرون ملک کانچ دیونیورسٹیوں کے ہزاروں آن لائن اسکا لرشپ فارم بھرتی ہے، مگر ہر جگہ سے انکار ہوتا رہتا ہے۔ بالا خرما چٹسڑیونیورسٹی سے اسے اسکا لرشپ مل جاتا ہے جو اس یونیورسٹی کی طلباء سوسائٹی اپنے ذاتی فنڈ سے دیتی ہے جس کی رو سے امرد کو تیس فیصد ادا کرنا ہوتا ہے باقی ستر فیصد کی ادائیگی ان کی طرف سے ہوگی۔ اس کے علاوہ دو دن کی میزبانی کے

مکمل ناول





بعد امرجہ کو اپنی رہائش اور اخراجات کا خود بندوبست کرنا ہو گا۔ یہ سب باتیں اسے برطانیہ پہنچنے کے بعد دلائم بتاتا ہے۔ وادو جی امرجہ کے لیے پیسے اکٹھے کر کے اسے برطانیہ بھجوا دیتے ہیں۔ باقی اسے خود اپنے بل بوتے پر کرنا ہو گا۔ عذرا، شرلی بیٹی لو اور لیلی کول سے اس کی ابتدائی ملاقات ہوتی ہے۔

امرجہ بڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک کافی شاپ میں جاب کرنے لگتی ہے اور لیڈی مہر کے گھر اس کی رہائش کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔ لیڈی مہر بے اولاد خاتون ہیں۔ انہوں نے اپنے ششل کا ک نامی اپنے ہاسٹل نمائندہ میں مختلف بچوں کو اولاد کی طرح رکھا ہے۔ ان ہی میں ایک عالیان مارگریٹ ہوتا ہے۔ وہیں سادھنا، ویرا اور این اون سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ جاب کے دوران وہ ڈیرک کے ساتھ مل کر ڈاکو منتر فلم بنانے لگتی ہے۔

اسی دوران امرجہ کے پایا جن کی اعظم مارکیٹ میں قالین کی دکان ہوتی ہے، آگ لگ جاتی ہے جس سے ان کا بیس پچیس لاکھ کا نقصان ہو جاتا ہے۔ انہیں انیک ہو جاتا ہے۔ امرجہ انہیں سلی دیتی ہے اور ڈاکو منتر فلم سے ملنے والے پیسے ان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ لیڈی مہر بھی اسے ایک چیک دیتی ہیں۔ امرجہ وہ رقم بھی پاکستان بھجوا دیتی ہے۔ امرجہ کے والد بہت خوش ہوتے ہیں۔ امرجہ اپنی کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے جب عالیان مارگریٹ کسی اسپائیڈر مین کی طرح اس کی کھڑکی میں جھانکتا ہے۔ امرجہ کی جج نکل جاتی ہے۔

عالیان بتاتا ہے یہ اس کا گھر ہے وہ اس کے کمرے کی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا، تھوڑی دیر بعد گھر میں آوازیں گونجنے لگیں تو سادھنا نے بتایا کہ لیڈی مہر کا بیٹا آیا ہے۔ وہ لیڈی مہر کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ وہ لیڈی مہر کے بید پر بیٹھا انہیں ایک کھلا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ لیڈی مہر نے ایک بار بتایا تھا کہ ان کا بیٹا بھی اس کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے اور بہت قابل ہے۔

امرجہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا نام عالیان تھا اور اس کی ماں کا نام مارگریٹ۔ اسے عجیب سا لگا نا جانا؟ دوسرے دن لیڈی مہر کی سالگرہ تھی، جوان کے بچوں نے بڑے اہتمام سے منائی۔ انہوں نے امرجہ کو عالیان کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے اسے ایک ادارے سے لیا تھا اور بڑی تن دی ہے اس کی تربیت کی ہے۔ امرجہ کو افسوس ہوا کہ اس کی ماں نے کبھی بیٹوں کی تربیت پر توجہ نہیں دی تھی۔ ویرا کا ساتھ امرجہ کو احساس دل رہا تھا کہ عورت بھی بہادر ہو سکتی ہے۔ عالیان کی توجہ نے امرجہ کو ایک عجیب احساس سے دوچار کر دیا وہ لاشعوری طور پر عالیان سے متاثر ہو رہی تھی۔

## تیسری قسط

اور مشرقی لڑکیوں کے لیے یہ موت جلد نازل ہوتی ہے۔ وہ برف سے الٹی زمین پر چل رہی ہے لیکن ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ وہ زمین میں دھنس رہی ہے۔ دل احساسات کا اکھاڑا ہے اور دماغ اس اکھاڑے کا شیر۔ یہ شیر دھاڑتا ہے تو دل جل کر۔ بجھ کر۔ ٹھنڈا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ مشرق کے اکھاڑوں میں یہ شیر مگر نگر پایا جاتا ہے۔ مشرق سنیا سی بھی ہے اور سامری بھی۔ مشرق میں یریت بھی ہیں اور باتل بھی۔

کما جاتا ہے کہ شادی ایک ایسا مقدس فریضہ ہے جس کی اوائی کے دوران آپ فرشتوں سے ”ابدی محبت“ کی دعاؤں کے تحائف وصول پاتے ہیں۔

اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شادی خوش نصیب لوگ کرتے ہیں۔

کچھ یہ بھی کہ کائنات میں حقیقی جشن کالجہ ودولوں کے مقدس ملن کالجہ ہوتا ہے۔

اور جائز ہونے کی بڑی اہمیت ہے۔ اور اجازت نامے کا بلند رتبہ ہے۔ بلند بہت بلند۔

اور پاک کتابیں، حکایتیں بتاتی ہیں کہ کائنات کی اشرف المخلوق کی اولین شادی عرش خدا پر انجام پائی اور بعد ازاں ہونے والی ہر شادی عرش خدا پر انجام پائی شادی کا ہی رتبہ پائی ہے۔

نکاح۔ سب سے پاک اور پسندیدہ روایت۔ نکاح۔ ودولوں کی فضیلت۔

اور داستانیں یہ بھی کہتی ہیں کہ تبت کے برفیلے پہاڑوں میں روپوش ایک مشک باریری، اپنی بہترین پوشاک میں طویل مسافت طے کرتی اس مشک مشک بندھن میں بندھنے والوں پر مشک بید (بید کے خوشبو دار پھول) برسا کر جاتی ہے۔ جاتے جاتے وہ تحفے کے طور پر دو لہاؤں کی مسکراہٹیں اپنی منہی میں قید کر کے لے جاتی ہے۔

اور شادی عہد قدیم کا وہ عہد نامہ بھی ہے جس کا دور ”عہد جدید“ میں بھی عزت و احترام اور محبت سے کیا جاتا ہے۔

مورگن کرسمس کی رات کو آچکی تھی۔ ماما مہر نے اس کی شادی کے لیے ٹھیک ٹھاک تیاریاں کی تھیں۔ کیسجین میں مورگن نے شادی کے بعد رہنے کے لیے جوش کے ساتھ مل کر ایک چھوٹا سا گھر لیا تھا۔ جس کی سجاوٹ کے لیے ماما مہر نے پیسے مورگن اور جوش کو دیے، جو دونوں نے بہت مشکل سے قبول کیے۔

مورگن نے شادی کے لباس، زیورات، شادی کے دن اور آئینہ پارٹی کے سب انتظامات ماما مہر کی پسند سے کیے تھے۔ حتیٰ کہ اس نے شادی کی انگوٹھی بھی ماما مہر کی پسند کی لی تھی۔

ماما مہر کے سامنے ان کی ”میں“ ختم ہو جاتی تھی اور ماما مہر بھی ان کی آنکھوں میں پڑھ لیتی تھیں کہ ان کے بچے کیا چاہتے ہیں، یہ ماں اور اولاد کا وہ رشتہ تھا جس کی مثال نہیں ملتی تھی۔

اپنی شادی کی تیاری سے زیادہ مورگن کو ماما مہر کے کام کرنے میں دلچسپی تھی۔ پارلر جانے سے زیادہ اسے یہ فکر تھی کہ ماما مہر نے میڈیکل چیک اپ کے لیے جانا ہے۔ جوش فون کرتا رہتا تھا اور وہ اسے چند سیکنڈ بات کر کے ڈانٹ دیا کرتی تھی۔

”مجھے ڈسٹرب نہ کرو، ماما کے ساتھ بات کر رہی ہوں۔“ کیسجین کی ہزاروں داستانیں وہ ماما کو سنایا کرتی اور دونوں کے قدموں سے ششل کا گونجا کرتا۔

مورگن نے سادھنا اور امرجہ کو Mates Brides (شہر بالیاں) بننے کے لیے کہا۔ امرجہ جس نے پاکستان میں اپنی نحوست کی داستانوں کی وجہ سے شادیوں میں شرکت نہیں کی تھی۔ وہ مورگن کی شادی کے لیے اتنی پرجوش تھی جیسے اس کی اپنی شادی ہو۔

لیڈی مہر نے شہر بالیوں کے لیے سنہری رنگ کو پسند کیا تھا۔ سادھنا کی سنہری ساڑھی بنوا دی گئی تھی۔ شیارلٹ اور مورگن کی چند سہیلیاں جن کی آمد متوقع تھی اور امرجہ کے لیے انگریزی طرز کی ٹخنوں تک لمبی فرائیں۔ فرائ کا اوپری حصہ قدرے چست تھا جو نیچے آتے آتے لمبے بناتے گھیر وار ہوتا چلا جاتا تھا۔ ذرا سی حرکت سے ان لمبوں میں تلاطم پیدا ہو جاتا جو بہت بھلا لگتا تھا۔ سنہری موتیوں سے فرائ کی پشت کو سجایا گیا تھا اور لمبوں میں اسے ٹانگا لیا تھا کہ جنبش بردہ لمبوں کے ساتھ جھلمل کرتے گپ چھپ ہونے لگتے تھے۔

امرجہ کے لیے دوپٹے کی جگہ سنہری اسکارف نما کپڑا تھا جسے کندھوں کے پیچھے سے لاکر بایں شانے پر آگے لہرے دے کر سنہری بروج لگا کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ کام فرائ کی ڈیزائنوں نے کیا تھا اور کیا کمال کیا تھا کہ امرجہ دوپٹے کے اس انداز پر حیران رہ گئی۔ دوپٹے کی کمی بھی



پوری ہو گئی اور فیشن بھی ہو گیا۔  
فراک بلاشبہ بہت مہنگی تھی اور امرجہ سے ایک پونڈ بھی نہیں لیا گیا تھا۔ لیڈی مہر کی لاڈلی بیٹی کی شادی تھی۔ سبانی جن بچوں نے شادیاں کی تھیں انہوں نے رجسٹر میرج کی تھی۔ یہ پہلی شادی تھی جو لیڈی مہر کی خواہش پر اتنے اہتمام سے ہو رہی تھی اگر مورگن کے بس میں ہوتا تو شاید وہ ایک پونڈ بھی اپنی شادی پر خرچ نہ کرتی۔ جب شادی کے ہال میں دلہن کے کمرے میں ماما مرنے مورگن کو دلہن بنے دیکھا تو وہ بے اختیار رونے لگیں۔ وہ مورگن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھی رہیں۔ اسے دعا میں دیتی رہیں۔ اس کی نظر اتار لی رہیں۔ اور مورگن اپنی گھیردار سفید پوشاک کو کارپٹ پر پھیلائے ماما مرنے کے قدموں میں بیٹھی ان کے آنسو اپنے ہاتھ میں پکڑے نشو سے صاف کرتی رہی۔ اس سے زیادہ مقدس منظر اور کون سا ہو سکتا تھا بھلا۔؟

گلابی پھولوں کا دستہ پکڑے کونے میں کھڑی امرجہ اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اپنی آئندہ زندگی میں وہ اس خاتون مرنے سے زیادہ عظیم ہستی سے نہیں مل سکتی نہ ہی وہ خود ان جیسی عظیم ہو سکتی ہے۔ جس نے ہر قوموں نسل کے بچوں سے والہانہ پیار کیا۔ انہیں بالائے انہیں اپنا بنایا۔ انہیں یقین دلایا کہ وہ ان کے نہ ہو کر بھی ان ہی کے ہیں۔ وہ ان کی حقیقی ماں بے شک نہیں ہیں لیکن حقیقی ماں سے کسی صورت کم بھی نہیں ہیں۔

یہ سب کرتے خاتون مرنے بلاشبہ دور تھے پائے ہیں۔ ایک عظیم ماں ہونے کے اور ایک عظیم انسان ہونے کے۔ انہوں نے ان سب کے لیے خوشیوں کے سالن اکٹھے کیے۔ کامیابی کے بھی۔ ان کے لیے محبت کو کبھی تفریق نہیں کیا۔ وہ انہیں جمع کر کے دیتی رہیں۔ انہیں ضرب ہو ہو کر ملتی رہی۔ کائنات میں یہ خصوصیت صرف محبت ہی اپنے نام رکھتی ہے۔ یہ دینے سے اور زیادہ ملتی ہے۔ یہ یلٹ

کر واپس ضرور آتی ہے۔ خسارے میں رہ کر بھی فائدے میں رہتی ہے۔  
محبت جب خلوص دل سے انسانیت کے نام پر کی جائے تو وہ آپ کو عظیم بنا دیتی ہے۔  
عظمت کی بلندیوں تک لے جانے کا وصف محبت کے علاوہ کسی اور جذبے میں نہیں۔  
اس لمحے میں امرجہ نے یہ سوچا تھا کہ کچھ لوگ ہمارے اپنے نہ ہو کر بھی ہمیں کتنی خوشی دے دیتے ہیں۔ اور کچھ جو ہمارے اپنے ہوتے ہیں وہ کیسے ہمیں آٹھ آٹھ آنسو رلاتے ہیں۔ وہ دادی اور اماں کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اپنے خاندان والوں کے بارے میں جنہیں اس وقت راحت ملا کرتی تھی جب وہ کرب میں ہوا کرتی تھی۔ اس کی شکل دیکھتے ہی انہیں یاد آ جاتا تھا کہ اسے کیسے کیسے تکلیف دی جاسکتی ہے۔

شہرہ بالیاں تین تین کی قطار میں دلہن مورگن کے پیچھے دائیں بائیں اپنے اپنے گلدستے پکڑے کھڑی تھیں۔ وہ ہال کے قد آدم دروازے کے پاس آکر کھڑی ہو چکی تھیں۔ دلہن گھبرا رہی تھی اور وہ بار بار اپنی سانسیں درست کر رہی تھی۔

ہال میں سب اس کی آمد کے منتظر تھے۔ دلہن کا ہی انتظار کیا جا رہا تھا۔ برطانوی معاشرے میں جہاں ایک منٹ ادھر سے ادھر ہونے نہیں دیا جاتا صرف ایک دلہن کو دس منٹ تاخیر کی اجازت ہے۔ لیکن انگریزی خون کی حامل دلہنیں دس منٹ کی تاخیر بھی گناہ سمجھتی ہیں۔ برطانوی شہزادی لیڈی ڈیانا کی ہو کیٹ ڈلٹن ڈیچز آف کیمرج نے ایک سیکنڈ کی تاخیر بھی نہیں کی تھی۔ پاکستانی دلہنیں اور باراتی سن لیس ایک سیکنڈ کی تاخیر بھی نہیں۔

اور وقت کی پابندی وہی قومیں کرتی ہیں جنہیں وقت پر منزل پر پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے۔ جو وقت کو ہندوستان کے گوہ نور سے زیادہ قیمتی سمجھتی ہیں۔ وہ نہیں جن کی کوئی منزل ہوتی ہے نا مقصد۔ وقت

آئے یا جائے ان کی بلا سے۔ اور وہ کیا جانے وقت کس ”گوہ نور“ کا نام ہے۔  
اور یہ خوش قسمتی بھی صرف عورت کے نصیب میں لکھی گئی ہے کہ دلہن بنے اسے کسی شہزادی اور ملکہ سے کم نہیں سمجھا جاتا۔  
عورتوں کو اپنی کم مائیگی کے رونے رونے چھوڑ دینے چاہئیں۔ وہ ماں بنتی ہیں تو وہ سب رشتوں سے الگ اونچے مقام پر کھڑی تصور کر لی جاتی ہیں۔ ایک کم عقل بھی سمجھ جاتا ہے کہ ”عورت ماں“ بن جائے تو پھر کوئی اور اس کی برابری نہیں کر سکتا۔

بلند وبالا چھت اور قد آدم پھولوں سے سجی کھڑکیوں سے گھرے قدیم برطانوی طرز تعمیر کے چرچ نما ہال کے سرخ قالین پر سفید رنگ کی سنڈریلا فرائیں پہنے اور سر پر گلابی رن باندھے دو انگریز بچیاں اپنی پھولوں کی ٹوکریوں میں سے پھولوں کی پتیاں نکال نکال کر دلہن مورگن کے آگے چلتے ہوئے پھینک رہی تھیں۔

دلہن نے ہال کے کھلے پھانک سے اندر قدم رکھا۔ سب کی گردنیں پیچھے اس کی طرف مڑیں۔ ٹھیک اسی وقت ہال کے اندر پارڈی سے ذرا ہٹ کر بیٹھے سولہ رکنی وائلن گروپ نے اپنے ساز سنبھالے اور نرمی سے انہیں چھیڑا۔ وہ اس دھن کو بجانے کی تیاری کرنے لگے جو فرشتوں کی دعاؤں کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے۔

ٹھیک اسی وقت۔ عین اسی وقت کوئی تیزی سے بھاگتے کالے سوٹ پر ہلکے نیلے رنگ کی ٹالی باندھتے دلہن کے پیچھے تین ادھر اور ادھر قطار کی صورت چلنے کی تیاری کرتی سہیلیوں کے پیچھے آیا۔ امرجہ دائیں طرف شارلٹ کے پیچھے آخر میں تھی۔

شہرہ پائیوں سے نکلی۔ ایک امرجہ۔ عربی شہزادے کے گھوڑے سے اترا۔ ایک نالیان۔  
وائلن کے دھیمے سراسی وقت دولہا دلہن سے بچے

ہال میں بٹھرے۔  
عالیان کی آمد کی ایسی خوشی۔  
کیا انٹری تھی عالیان کی۔ وہ سرنگیت ساتھ لایا تھا۔  
آہٹ پر امرجہ نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ جلدی جلدی اپنی ٹالی کو باندھنے کی کوشش کر رہا تھا شاید اس نے زندگی میں پہلی بار سوٹ اور ٹالی پہنی تھی۔ ٹالی کو وہ ایسے باندھ رہا تھا جیسے گلے میں پھندے کو فٹ کر رہا ہو۔

اسے تو ایک ہفتے بعد آنا تھا، ایک ہفتہ پہلے کیسے آ گیا تھا۔ امرجہ کے پیچھے چلتے وہ اپنی ٹالی کے ساتھ مصروف تھا۔ شاید اسے بھی خود کو ہر صورت دولہا کی طرح خوب صورت دکھانا تھا۔ اس کے بال سلیقے سے جتنے تھے۔

”کہا جاتا ہے کہ شادی کے دن کوئی مرد اور کوئی عورت دولہا دلہن سے زیادہ خوب صورت نہیں لگ سکتے۔ اور میرا یہ کہنا ہے کہ اگر کوئی لڑکا لڑکی دولہا دلہن سے زیادہ خوب صورت لگنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کے معاملے میں شدید گڑبڑ ہوتی ہے۔ اس کی شادی

خلع عیسیٰ میں



فلاخو جبین

قیمت - 400 روپے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ  
32735021 فون نمبر:  
37، اردو بازار، کراچی



نہیں بھی ہوتی اور وہ اپنی شادی جیسا خوش ہوتا ہے۔  
ہسنے کی بات نہیں بھی ہوتی اور وہ ہنس رہا ہوتا ہے۔  
شدید گڑبڑ کا معاملہ ہوتا ہے بلاشبہ مجھے بتایا جائے کہ  
دلہن کون ہے؟ کیا صرف سفید لباس والی؟

امرحہ کے عین پیچھے چلتے موتوں سے گندھے  
بالوں سے ذرا پیچھے ذرا قریب ہو کر سرگوشی میں پوچھا۔  
امرحہ نے اس کی بات پر توجہ نہ دی۔ وہ سفید پھولوں سے  
سجے ہال کو دیکھ رہی تھی اور بے حد اونچی چھت سے  
جھولتے کئی میٹر چوڑے اور لمبے فانوس کو جس کی  
روشنی نے سارے ہال کو قہر نور بنا ڈالا تھا۔ وانٹن تھے  
قمقمے تھے پھول تھے قمقمے تھے دو لہا دلہن تھے  
عالیان اور امرحہ تھے اور اس تقریب کو کیا چاہیے تھا؟

لیڈی مہر کے سب بچے اپنے اپنے بچوں بیویوں اور  
کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ موجود تھے۔ باقی جوش  
کے گھر والے رشتے دار اور دوست تھے۔ کافی زیادہ  
لوگ تھے سب دو اطراف نشستوں پر براجمان تھے۔

امرحہ کے پیچھے سے گھوم کر ماما مہر کے ہاتھ کو چوم کر  
عالیان جلدی سے جا کر دو لہا کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس  
نے جوش سے ہاتھ ملایا۔ اپنا تعارف کروایا اور جوش  
کے شہر بالا کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا۔

دلہن پادری کے سامنے اور دو لہا کے سامنے آکر  
کھڑی ہو گئی۔ سب کھڑے ہو گئے۔ تعظیم میں پھر  
شادی کی رسم شروع ہو گئی۔

اجازت نامہ دیا جانے لگا۔  
اجازت نامہ دہرایا جانے لگا۔  
شہر بالیاں دلہن سے پیچھے ہٹ کر قطار میں کھڑی  
ہو گئیں۔ وہ سب دو لہا اور دلہن کو دیکھ رہی تھیں۔

امرحہ واجد آج بہت خوش تھی۔ یہ پہلی تقریب  
تھی جس میں وہ روئے بنا شریک تھی۔ ڈرے پنا۔  
اسے کونے میں جھینپ کر بیٹھنے کی جلدی تھی نہ  
ضرورت۔ اس کے لیے وقت بدل چکا تھا۔ وہ  
پھولوں کو تھامے گردن اٹھائے مسکراہٹ سجائے  
خوب صورت لگ سکتی تھی۔ خوش ہو سکتی تھی۔

وہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ خوش تو وہ بلاشبہ  
بہت تھی۔

مشک بار پری آچکی تھی اور مشک بید بر ساری تھی  
شاید وہ تھوڑی سی اور مہیاں ہو گئی ہو اور اس نے  
دلہن کی طرح ہی خوب صورت لگنے والی امرحہ پر بھی  
کچھ مشک بید برمائے ہوں۔

اگر اس نے یہ کام نہیں کیا تھا تو یہ کام عالیان کر رہا  
تھا۔ اس کی بھوری آنکھیں سنہری ہوتی جا رہی  
تھیں۔ امرحہ اس سے ذرا فاصلے پر سامنے کھڑی  
تھی۔ امرحہ کو نہیں معلوم تھا کہ وہ دو لہا کے پیچھے کیسے  
کھڑا ہے نہ ہی اس نے معلوم کرنا چاہا اور عالیان کو یہ  
معلوم نہیں تھا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی ہال میں موجود

ہے۔  
”دو لہا۔ دلہن۔ اچھا۔ اور دوسرے لوگ  
کیا واقعی یہ ہال میں موجود ہیں۔ ایسا ہو گا۔ میرا  
نہیں خیال۔“

قدیم اور رُشکوہ چرچ نما کئی سو گلدستوں سے سجے  
وسیع ہال کے جھلک کرتے فانوس کے عین نیچے نیچے  
سرخ قالین پر کھڑا گرانٹ پریناں کے سر کی طرف  
جھک رہا تھا۔ اس بار وہ ”Gloxinia“ کو اس کے  
نفاست سے گندھے سنہری موتی جڑے بالوں میں لگا  
رہا تھا پھر اس نے پریناں کے ہاتھوں کو تھام لیا اور دلہن  
کی طرف دیکھنے کا اشارہ کیا۔ ”تم میرے لیے بیٹھ  
اس پہلے دن کی دلہن کی طرح خوب صورت اور خاص  
ہو گی۔“

”اس بار تمہیں اس عہد نامے کو سب کے سامنے  
دہرانا ہو گا۔“ پریناں نے ادا سے کہا۔  
”میں عالیان کے ساتھ اس عہد نامے کو دہرانے  
کے لیے تیار ہوں۔“

”میں امرحہ کی طرح انتظار کرنے کے لیے تیار  
ہوں۔“ پریناں نے بالوں میں لگے ”Gloxinia“ کو  
محبت سے چھو کر کہا۔ ساتھ ہی وہ مسکرائی۔ وہ  
مسکرا سکتی تھی اس کے ہاتھ گرانٹ نے تھام رکھے

تھے۔  
عالیان مسکرایا۔ وہ مسکرا سکتا تھا۔ اس کی  
آنکھوں نے سنہرے رنگ کو تھام رکھا تھا۔ گلابی  
پھولوں کے گل دستے میں مسکراہٹ اٹکی تھی۔  
جھلک کرتی موتی جڑی لہروں میں اس کا دل لک چھپ  
گپ چھپ ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا  
کہ وہ کیا کرے۔ بھاگ کر جائے اور وانٹن کو اپنی  
ٹھوڑی تلے لے کر دھندلے کر ڈالے یا۔ چھت  
کے ساتھ جھولتے فانوس کے ساتھ جھول جائے اور  
اعلان کرنا پھرے۔ یا کئی سو پھولوں کے گل دستوں کو  
اپنی بانہوں میں بھر کر سنہری پوشاک کے قدموں تلے  
ڈھیر کر دے۔

اور یہ بھی کم تھا۔ یہ سب بھی کم تھا۔  
سب کم ہی ہوتا ہے۔ سب کم ہی لگتا ہے۔  
محبت اس عروج کا جذبہ ہے کہ سب ادائیگیاں تولد  
باشہ ہی لگتی ہیں۔

\*\*\*

یونیورسٹی پھر سے آباد ہو چکی تھی۔ سترہ جنوری  
سے امتحانات شروع تھے۔ سب دن رات پڑھنے میں  
مصروف ہو چکے تھے۔ اس کے سب دوست اس کے  
لیے کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر آئے تھے۔ وہ خوش تھی کہ  
سب نے اسے یاد رکھا تھا لیکن وہ کسی کو بھی یہ بتانہ سکی  
کہ اس نے سب کو کتنا یاد کیا تھا۔ ان کے جانے کے  
بعد اس کا کیا حال ہوا تھا۔

”میں واپس آچکا ہوں۔“  
”مجھے نظر آ رہا ہے۔“ مورگن کی شادی کے بعد  
یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔  
”تو چلیے پھر؟“ وہ سویڈن کاپانی پی کر پہلے سے زیادہ  
خوب صورت ہو کر آیا تھا۔

”کہاں؟“  
”ہوم کمنگ ڈرنک کے لیے۔“ (گھر واپسی کی  
دعوت کے لیے)  
جو جا چکے تھے انہوں نے جو مچھڑ میں رہ چکے تھے

سے ہوم کمنگ (Coming) ڈرنک پی تھی۔  
کھانے پینے کا اچھا انداز تھا۔  
”میں کسی ایسی ڈرنک کو نہیں جانتی۔“ وہ صاف مکر  
گئی جبکہ وہ برالین اون کو پلا چکی تھی۔  
”نہیں جانتیں تو میں بتا دیتا ہوں ٹوٹی ولسن کہتا ہے

”This is Manchester we do  
things differently here“

(یہ مچھڑ ہے ہمیں انفرادیت کا جذبہ ہے)  
تو جب ہم گھر واپس آتے ہیں تو اسے بھی مختلف  
انداز سے ٹریٹ کرتے ہیں۔ تم مچھڑ میں ہو، ہمیں یہ  
کرنا پڑے گا۔ صرف دو پونڈ کی کاک ٹیل۔ اور  
بس۔“ وہ جان چھوڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

وہ اسے دو پونڈ کی کاک ٹیل کے لیے قریبی کیفے میں  
لے آئی جہاں اور بھی بہت سے اسٹوڈنٹس دو پونڈ کی  
کاک ٹیل پی رہے تھے۔  
”نئے سال کے لیے کیا کیا عہد و بیان کیے ہیں تم  
نے؟“

”سستی نہ کرنا اور وقت پر نوٹس بنانا۔ دوسرے  
سمسٹرز میں 80٪ رزلٹ لانا۔“ عزم سے کہہ کر وہ  
مسکرائے گی۔  
وہ ہنسنے لگا لیکن امرحہ نے تو کوئی لطیفہ نہیں سنایا  
تھا۔

”اب تم نے کیوں؟“  
”کیونکہ تحقیق کہتی ہے کہ ساٹھ فیصد سے زیادہ  
لوگ سال کے پہلے ہی ہفتے خود سے کیے عہد کو بھلا  
دیتے ہیں اور باقی کے چالیس فیصد سے زیادہ افراد یہ کام  
چھ ماہ کے اندر کر گزرتے ہیں۔“

”میں ان ساٹھ فیصد میں سے ہوں نہ ہی چالیس  
فیصد میں سے۔“ اس نے عزم سے کہا۔  
”مجھے فخر ہے تم پر۔“ اس نے اسے چڑایا۔ دو پونڈ  
کی ڈرنک وہ آہستہ آہستہ پی رہا تھا کہ وہ ختم نہ ہو  
جائے۔

”تم دیکھ لینا میں شان دار کامیابی حاصل کروں  
یا نہیں؟“



گی۔" میں ضرور دیکھنا چاہوں گا۔" سوئیڈن کا پانی اسے بری طرح سے راس آیا تھا۔  
 "تم مجھے چیخ دے رہے ہو۔"  
 "میں تمہیں چیخ دے رہا ہوں۔" نیبل پر مکار کر اس نے کہا۔  
 "اگر میں جیت گئی۔؟" امرجہ نے انگلی اٹھا کر کہا۔

"مشکل ہے۔"  
 "اگر میں جیت گئی ہوں۔ پھر؟"  
 "ناممکن ہے۔" دونوں شانے ناں میں ہلائے۔  
 امرجہ نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔ "پاکستان میں ایسے موقع پر کہا جاتا تھا تمہارے منہ میں خاک۔" وہ یہ بڑبڑا کر رہ گئی۔  
 "تو جو تم کوئی عیسوی وہ کروں گا۔ وہ گلے میں پھندا ڈال کر چھت سے لٹک جانا ہی کیوں نہ ہو۔" اوہ اتنا تالاف سمجھتا تھا وہ امرجہ کو۔  
 "ٹھیک ہے پھر ڈیڑھ سال بعد ملتے ہیں۔ اسی میز پر تیار رہنا پھندا ڈالنے کے لیے۔"  
 "مطلب تم ڈیڑھ سال تک مجھ سے ملو گی نہیں۔ میں چیخ واپس لیتا ہوں۔"  
 "اف! مطلب اس معاملے کو ہم ڈیڑھ سال بعد دیکھیں گے۔"  
 "ٹھیک ہے۔" وہ مسکرانے لگا۔ چڑانے والی مسکراہٹ۔

"یہ انگریز خود کو سمجھتے کیا ہیں۔ سمجھتے ہیں سب یہی کر سکتے ہیں۔ ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ سب کر سکتے ہیں ہم۔ خیر امرجہ دیکھ لے گی اس انگریز کو اب۔ امتحانات میں ایک ہفتہ تھا اور سب جنوری کے پہلے ہفتے ہی واپس آ چکے تھے اور جنوری کی برف باری میں ایران کا محسن رسولی اور مصر کا موسیٰ فٹ بال کھیلنا چاہتے تھے امتحان تو پھر آجائیں گے بلکہ سال میں دوبار۔ لیکن ایسی غضب کی سوسالہ ریکارڈ توڑتی برف باری شاید پھر نہ آئے۔ ایرانی اور مصری یقیناً"

سوئے میں بھی خود کو فٹ بال کھیلنے پاتے ہوں گے۔ اور اپنی زندگی کے خاص دن "شادی" پر بھی فٹ بال کھیلنے کے بلاوے کو رد نہیں کر سکتے ہوں گے۔  
 محسن رسولی نے دو ٹیمیں جمع کر لی تھیں، میچ کے لیے برف سے اٹے گراؤنڈ میں رات کو میچ تھا۔ برف کا ڈھیر اور اس پر فٹ بال میچ۔ واہ۔۔۔  
 "تم بھی میرے ساتھ کھیلو گی؟" ویرا نے کہا۔  
 امرجہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

"کیا مصیبت آگئی ہے تمہاری جان پر؟" ویرا نے گھونسا مار اس کی کمر پر۔  
 "میں نے بھی موبائل پر فٹ بال ٹیم نہیں کھیلی۔ تم مجھے برف پر خو خوار کھلاڑیوں کے ساتھ کھیلنے کو کہہ رہی ہو۔ یعنی میری موت برف پر واقع ہوئی ہے۔"  
 "کون سا کھیل کھیلتی ہو تم؟" ویرا ایک اور گھونسا مارنے کے لیے تیار ہوئی۔

"لڈو۔ دادا کے ساتھ۔ بابا، کبھی کبھی کرکٹ۔ وہ بھی اگر کوئی بچہ گیند کروائے آہستہ سے تو میں بلا چلا لیتی ہوں۔ ٹیس بال سے ہارڈ بال سے بالکل نہیں۔"  
 "تو تم لڑکیاں فارغ وقت میں کرتی کیا ہو پاکستان میں؟" سائیکل تم نہیں چلاتیں، دوڑ لگانے کے لیے تمہیں کہا تو تم نے انکار کر دیا تھا۔ کوئی ٹیم بھی نہیں آتی تمہیں۔ کھانے کے علاوہ کچھ کرنا آتا ہے؟"  
 "ہاں نا۔ چغلیاں کرنا اور بات بات پر لڑنا۔"  
 امرجہ نے اردو میں کہا اور ہنسنے لگی۔

تو امتحان چھ دن بعد شروع تھے اور وہ میچ کھیلنے کی تیاری کر رہے تھے۔ لڑکیوں میں ایک ویرا تھی اور ایک لاء ڈیو پیارٹمنٹ کی وکٹوریہ۔ وکٹوریہ کارل کی ٹیم میں تھی اور ویرا محسن رسولی کی ٹیم میں۔ جس طرح کی بمبار کھلاڑی ویرا تھی اسے دونوں ٹیمیں شامل کرنے کے لیے تیار تھیں لیکن ویرا نے چالاک کی اس نے محسن رسولی کی ٹیم میں شمولیت کی۔ محسن رسولی یونیورسٹی میں اپنے فٹ بال کے لیے ہی تو مشہور تھا اس کے امکانات روشن تھے میچ جیتنے کے۔ اور وہی

ہوا، محسن رسولی کی ٹیم میچ جیت گئی۔ تین دو سے۔ سو دو سو کے قریب اسٹوڈنٹس آئے تھے میچ دیکھنے، دستاویز بننے، مفلر لپٹے، کافی پیتے، منہ سے بھاپ اڑاتے۔ ہر گول پر گراؤنڈ کو سربراٹھا لینے والے۔ امرجہ کو بھی بڑھنا تھا لیکن وہ ویرا کے لیے آگئی تھی۔ اور اچھا ہی کیا آگئی ورنہ برف کے ڈھیر پر فٹ بال کے ساتھ بمباری کرنی ویرا کو کیسے دیکھتی۔ امرجہ کا حلق بیٹھ گیا تھا چلا چلا کر۔ اس نے کسی قدر حسرت سے ویرا کو دیکھا، وہ برف کے ڈھیر پر فٹ بال کے ساتھ ایسے بھاگ رہی تھی جیسے لاونچ میں کاربٹ برہاگ رہی ہو، اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے کہ وہ برف میں خود کو دفن کر لے گی ہمارے گی نہیں۔ کارل نے پہلا گول کیا تھا اور ویرا نے اسے ایسے دیکھا تھا جیسے اس کی گردن دیوچ لے گئی۔ اور اس نے گردن دیوچ جلی تھی، اس نے یکے بعد دیگرے دو گول کیے تھے۔ مخالف ٹیم کی کمر توڑ ڈالی تھی۔ وہ پریشمیں آئے اور بمشکل مزید ایک گول کر کے ہار گئے۔

"ویرا۔ ویرا!" اسٹوڈنٹس نے گراؤنڈ سربراٹھا لیا۔ ویرا نے ڈیوڈ دیکھم کی بے نیازی اور میسی کی چھپی رستی لیے اسٹوڈنٹس کو دیکھا، ہاتھ لہرایا۔ اور اپنی دائیں آنکھ کے کنارے کو رگڑ کر کارل کو دیکھ کر آنکھ ماری۔ کارل کو تو آگ ہی لگ گئی۔ اس کی شکل دیکھنے لائق تھی۔ ٹیم غصے میں آکر بھڑک چکی تھی اور شاید ویرا یہی چاہتی تھی۔ وہ بھڑک بھڑک کر برف پر گرتے جاتے تھے۔ محسن رسولی کی ٹیم فٹ بال لیے لیے اڑی جاتی تھی۔ ویرا برف کی پیداوار تھی اسے برف پر ہرانا مشکل تھا۔ یہ اس کی بے عزتی ہوتی۔ اور اس نے روس کی برف کی عزت رکھ کر۔ وہ لوگ میچ جیت گئے۔

امرجہ کو بڑی خوشی ہوئی ویرا کے جیتنے کی نہیں کارل کے ہارنے کی۔ وہ سب لوگ گراؤنڈ کے گرد گھیرا بنائے کھڑے دونوں ٹیموں کے میچ دیکھ رہے تھے میچ ختم ہوا تو سب کو پھر سے پڑھائی یاد آگئی اور سب جلدی جلدی کھسکنے لگے۔ اب امرجہ نیٹ کے

پاس کھڑی منہ کھولے ہنس رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا ویرا کو کندھوں پر اٹھا لے۔ ورنہ کارل کو ہی اٹھا کر پھینک دے۔ اور نہیں تو پیٹ پکڑ کر برف پر لوٹ پوٹ ہوتے ہنستے۔ کچھ میچ اس نے دادا کو بھی دکھایا تھا اور وہ بھی ویرا اور اچلا کر لاہور میں بیٹھے ویرا کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔

"تمہیں بڑی ہنسی آرہی ہے۔" وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا، کافی سنجیدہ لگ رہا تھا جیسے ہار کے بعد لوگ لگا کرتے ہیں۔  
 "ہاں آرہی ہے۔" امرجہ نے منہ کھول کر ایک اور قہقہہ لگایا۔ برا کیا۔

آنکھوں کو چندھیا کر کارل نے اسے تازا۔ جیسے کہا "اچھا تم۔ تم ٹھیک ہے پھر۔"  
 وہ چند قدم آگے چلا اس کے ہاتھ میں فٹ بال تھا اور پھر وہ ایک دم سے پلٹا۔ امرجہ ویرا کی طرف جانے ہی لگی تھی۔ اس کا دھیان کارل کی طرف نہیں تھا، کارل نے پلٹ کر پوری قوت سے اس کے سر پر فٹ بال کی لگ لگائی۔ امرجہ توازن قائم نہ رکھ سکی اور گر گئی۔ جیسے ہی وہ گری کارل نے تیزی سے اس کے سر پر جمی سرخ اونٹنی ٹوپی کو کھینچ کر اس کی ناک تک گھسیٹ دیا۔ جی ناک تک۔

"یہ کیا بد تمیزی ہے؟" امرجہ چلائی۔ یہ بھی برا کیا امرجہ نے کارل نے مٹھی بھر برف اس کے چلاتے منہ میں ٹھونس دی۔ امرجہ نے ہاتھ سے برف منہ سے نکالی۔ کارل نے تیزی سے اپنے گلے میں سے اونٹنی مفلر کو نکال کر اس کی گرہ بنا کر اس کے دونوں ہاتھوں میں ڈالی اور گرہ کس دی۔ وہ جواٹھنے کی کوشش کر رہی تھی اور لڑھک گئی۔

"یہ کیا؟ ٹوپی ناک تک۔ برف منہ میں۔ ہاتھ بندھے ہوئے۔ چیخ۔ اب کارل نے کسی مشین کی طرح اس پر برف اچھالنی شروع کر دی۔ امرجہ منہ سے بمشکل برف اگل سکی۔ اس کے دانت ٹھنڈ سے ٹوٹ جانے کے قریب تھے اور کارل منحوس اسے برف کے ڈھیر میں دفن کر رہا تھا۔ وہ کھلے عام منہ کھول کر



ہنس رہی تھی۔ اب ظاہر ہے ہارے ہوئے لوگوں کو ایسی ہنسی بری بھی لگ سکتی ہے۔

”ویرا!“ امرجہ بمشکل چلائی۔ ویرا اذرا اور محسن رسولی کے ساتھ میچ کی صورت حال پر غور کر رہی تھی۔ امرجہ کی طرف اس کی پشت تھی۔ کارل کسی کرین کی طرح اس پر برف اچھالتا ہی جا رہا تھا اور اس نے امرجہ کو برف کے ڈھیر میں دفن کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے امرجہ برف میں۔ یہ دن بھی دیکھنا تھا امرجہ نے۔

”ویرا!“ اس کی آنکھوں پر ٹوپی تھی۔ اسے نظری نہیں آ رہا تھا کہ ویرا کہاں ہے۔ برف کا ایک ڈھیر اس کے منہ پر آ کر گر کر لہو اور چلاؤ۔ کاش وادی کا کماچ ہوتا وہ واقعی منحوس ہوتی اور کارل کے ہاتھ ٹوٹ جاتے اس کے ساتھ یہ سب کرتے۔

”کارل!“ ویرا کی دھانسنائی دی۔ اس نے بڑھ کر امرجہ کے سر پر سے ٹوپی اٹھائی اور امرجہ نے دیکھا کہ ویرا نے ایک بے حد ناکام کوشش کی اپنی ہنسی کے فوارے کو روکنے کی۔

وہ گردن تک برف میں دھنس چکی تھی، ناک سرخ ہو چکی تھی۔ ہونٹ نیلے اور غصے سے وہ نیلی، پیلی، لال سب ہو رہی تھی۔

جیسے ہی ویرا نے ٹوپی اٹھائی۔ کارل اور ویرا دونوں کے منہ سے ہنسی کے فوارے نکلے۔

”دادا! آپ ٹھیک کہتے ہیں مجھے امرجہ نہیں ویرا ہونا چاہیے۔“ امرجہ نے دل میں سوچا جب ویرا اسے برف سے نکال کر کھڑا کر چکی تو کارل نے امرجہ کی طرف اشارہ کیا۔

”میچ ہو جائے۔ تم اور میں۔“ کیا بات کی تھی کارل نے وہ بھی امرجہ سے۔

”اسے فٹ بال نہیں آتا۔ مجھ سے بات کرو۔“

”تم پرے رہو۔“ Ginger Ball۔

مجھے اس The Lost Duck سے بات کرنے۔

”The Lost Duck“ وہ جب کارل کی شکل دیکھنے لگی غصے میں اتلا لال پیلا ہونے کے باوجود وہ اس

کے خلاف کچھ نہ کر سکی۔ چیخ۔ افسوس۔

”میں پچیس فٹ کے فاصلے سے ہم ایک دوسرے کے سر پر فٹ بال کی کک لگائیں گے۔ وقت دس منٹ ہو۔ پلوٹو سر پر لگا بال ایک گول ہو گا۔“

”پلوٹو۔ ایک اور نام۔“ پلوٹو خاموش کھڑا اندازہ لگا رہا تھا کہ کیا وہ یہ کر سکتی ہے، نہیں وہ یہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اندازہ لگایا جا چکا تھا۔

”چلو اسے اور آسان کر لیتے ہیں۔ فاصلہ پندرہ فٹ۔ وقت دس منٹ۔“

”نہیں۔“ امرجہ نے انکار کر کے جان چھڑائی۔

”فاصلہ دس فٹ۔“ وہ آج ہر صورت اس کے سر پر کک لگانا چاہتا تھا۔

”نہیں۔“ امرجہ نے ایسے کہا جیسے شاہ ایران اسے اپنا تخت پیش کرتے ہوں کہ آج سے آپ اسے سنبھالیں اور وہ کہتی ہو ”نہیں بھی۔ بس نہیں کہہ دیا نا۔ بس نہیں۔“

”نہیں۔“ کارل نے واضح دانت پر دانت جمائے اور غصے کو چھپا کر اس کی طرف دیکھا کہ وہ یہ بھی نہیں کر سکتی جو پانچ سال کے بچے بھی کر کے جیت سکتے ہیں۔ کارل کو بس موقع چاہیے تھا اس کا سر پھوڑنے کا۔

اسے برف کی مار مارنے کا۔

”چلو دس قدم۔ ہارنے والے کو برف میں گردن تک صبح تک دھنسنے رہنا ہو گا۔“ Ginger Ball نے

امرجہ کو آنکھ ماری کہ کھیل لو۔ پر پاگل تھی کیا وہ ابھی شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کی حیثیت نہیں ہوئی تھی اس کی۔

”امرجہ کے لیے میں کھیلتی ہوں۔“ ویرا نے ہاتھ اٹھایا۔

”تمہارے لیے کھیل بدل جائے گا۔ بیس فٹ کا فاصلہ رکھ کر بھاگتے ہوئے ہاتھ سے ہمیں سر پر بال مارنی ہوگی۔ وقت دس منٹ۔“

”ٹھیک ہے!“ شاہ ایران کا تخت ویرانے قبول کیا۔ اسٹاپ وارج امرجہ کو دے کر ان کا کھیل شروع ہو گیا۔

بیس فٹ کا فاصلہ رکھ کر فٹ بال کو درمیان میں رکھ دیا گیا۔ فٹ بال پر پہلے کارل چھٹا ویرا بھاگی لیکن کارل نے پھرتی سے اس کے سر پر بال دے ماری۔ بال ویرا کے ہاتھ آگئی۔ اس نے کارل کا نشانہ لیا لیکن کارل بھل دے گیا۔ بال کارل کے ہاتھ آگئی، ویرا کو بال کو اپنے سر پر لگنے سے بچانا بھی تھا اور بال کو اپنے قابو میں بھی کرنا تھا۔ برف پر پھسلے گرتے، بال پر جھپٹنے مقابلہ نویں سنٹ میں پانچ چار تھا۔ کارل پانچ۔ ویرا چار۔

دسویں سنٹ میں کارل نے ویرا کے سر پر ایک اور گول کر دیا۔ ویرا بری طرح سے برف پر گری۔

”آخری سنٹ!“ امرجہ چلائی۔ وہ بھاگنے کی تیاری کر رہی تھی۔ آخری سنٹ میں ویرا زیادہ سے زیادہ ایک ہی گول کر سکتی تھی نا۔ گراؤنڈ میں چند ایک اسٹوڈنٹس ہی موجود تھے جو ویرا اور کارل کی مستیاں دیکھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا وہ مذاق میں کوئی کھیل کھیل رہے ہیں۔

”آخری پندرہ سیکنڈز۔“ امرجہ پھر زور سے چلائی۔ وہ بھاگتے بھاگتے ویرا کے قریب جا چکی تھی۔ کارل ان سے دور تھا۔ بال ویرا کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے کارل کے سر پر دے ماری لیکن کارل پھرنے لگا۔

اور وہ بال پر جھپٹا۔ وہ پھرتی سے جھک کر بال اٹھا ہی رہا تھا کہ ویرا پھولے ہوئے سانس کے ساتھ چلائی۔

”امرجہ۔ بھاگ۔“ کہتے وہ خود بھی برفانی چیتے کی طرح گیٹ کی طرف بھاگی۔ امرجہ بھاگنے کی تیاری تو کر رہی رہی تھی پر ویرا کے کہتے ہی اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

”بھاگ امرجہ!“ ویرا پھر چلائی۔ کارل ان کے پیچھے جنگی تیندوے کی طرح چلا۔

امرجہ نے اپنی لاہور میں کھائی خوراکیں زندہ کیں اور پورا زور لگا کر بھاگی۔ ویرا نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنی رفتار کے ساتھ بھاگنے لگی۔ لیکن کہاں ویرا کہاں امرجہ۔ امرجہ برفانی چیتا تصور ہی نہیں۔

جتنی مرضی صحت بخش غذا میں کھائی ہوں۔ ان

کا استعمال تو کبھی نہیں کیا گیا تھا نا۔ بھاگی تو کبھی نہیں تھی۔ ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔ ایسے برف ملی تھی نہ کارل نا ہی بلا۔ جو ان کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

ویرا کے ساتھ بھاگتے امرجہ منہ کے بل گرتے گرتے کئی بار گئی۔ امرجہ گر جاتی کارل (موت) اسے پیچھے سے آتی تو ہمت ہی برا ہوتا۔

کارل کہیں پیچھے برف پر پھسل کر گر گیا تھا ورنہ وہ ان سے دس قدم پیچھے نہ ہوتا۔ ویرا اپنی سائیکل پر جھپٹی اور اسے چلایا۔ امرجہ چلتی سائیکل پر بیٹھی۔

ویرا نے ہی اسے چلتی سائیکل پر بیٹھا اور آگے بڑھا تھا اس کا ماننا تھا۔ ایمرجنسی میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں کام آتی ہیں۔

ایمرجنسی ”کارل“ میں یہ بات کافی کام آ رہی تھی۔

ویرا نے اپنی رولر کو سڑک دنیا کی تیز رفتار ترین جلابانی ٹرین بنا ڈالا جو چلتی ہے تو لگتا ہے اڑ رہی ہے۔ رولر کو سڑک بھی اڑ رہی تھی۔

”ویرا!“ کارل کی آواز ان کے پیچھے آئی۔ پھولے سانس کے ساتھ وہ چلایا۔

”کون ویرا؟“ ویرا چلائی اور یہ جاہ جا۔

جب وہ کارل کی پیچ سے دور ہو گئی تو رولر کو سڑکی رفتار آہستہ کی گئی۔ ہنس ہنس کر ان کا برا حال تھا۔

برف سے ڈھکے چھپے مانچسٹر میں ان کی ہنسی کے قہقہے جل بجھ رہے تھے۔ امرجہ شاید ہی اپنی زندگی میں کبھی اتنا ہنسی ہوگی۔ اس کا پیٹ پھٹنے کے قریب تھا۔

”تم ہار کیسے گئیں؟“ امرجہ نے اس کی ٹمر میں چٹکی بھری یعنی میرے لیے کھیلتے ہی ہار گئیں یو ”Ball“

”Ginger“

”کبھی انسان بار بھی تو جاتا ہے، ہے نا۔ ویسے اگر میں جیت جاتی تو کارل نے بھاگ جانا تھا۔ ہم اس جن کو برف میں دھنسا سکتے تھے بھلا۔“

”میری وادی کا ماننا ہے میں منحوس ہوں۔ میری وجہ سے سارے کام خراب ہو جاتے ہیں۔ آگ



لگ جاتی ہے۔ تباہی بربادی ایسا سب ہو جاتا ہے۔

میں بڑبڑا کر اٹھا۔ آج تو میرا پہلا پیر ہے۔ گھر کی اور کھڑکی دونوں کی طرف دیکھا وہ گوش شام کے پانچ بج گئے۔ خدا یا۔ میرا تو پہلا پیر تھا۔ میں تو رات بھر پڑھتا رہا تھا۔ پھر کیا ہوا۔ پھر کیا ہوا آخر۔ یعنی میرا پیر گیا۔ یعنی اب یونیورسٹی کا دین بھی مجھے مل ہونے سے نہیں بچا سکے گا۔ میں اتنا وقت سوتا کیسے رہ گیا؟

کیا میں ساری رات پارٹی کرتا رہا۔ سارا دن سوتا رہا۔ نہیں میں تو علی کا منتر میں تھا۔ نہیں شاید میں تو لا بیرری میں تھا۔ وہ گوش میں کہاں تھا۔ آخر کوئی مجھے بتائے گا کہ میں کہاں تھا۔ میں نچلے فلور پر واقع شاہ ویز کے کمرے کی طرف بھاگا۔ اس کا دروازہ دھڑ دھڑا رہا۔

”شاہ ویز! میں کل رات کہاں تھا بڑی جلدی بتا۔“

اف شاہ ویز بھی سو رہا تھا۔ میری طرح اس کا امتحان بھی گیا۔ وہ بھی فل۔

”مجھے کیا پتا تم کل رات کہاں تھے۔ سونے دو مجھے۔“ شاہ ویز اندر سے ہی چلایا۔

”تمہارا بھی پیر گیا یادے کر آئے ہو؟“ میں اس کے کمرے کے بند دروازے کے پار چلایا۔

”پیر۔۔۔ وہ تو صبح ہے۔ اب دفعتاً ہو جاؤ۔“

”صبح تو گزر گئی۔ شام کے پانچ بج رہے ہیں۔“

”تم ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں کیوں نہیں لگاتے صبح کے پانچ بجے ہیں شام کے نہیں۔“

”اوہ اچھا۔ صبح میں۔۔۔ آہ گوش میری توجان ہی نکل گئی تھی۔“

یہ کیل تھا، ایگز امز کے بے جا دباؤ کا شکار بے چارہ اسٹوڈنٹ۔ یعنی مائچسٹر یونیورسٹی میں اس دیو کا نڈل ہو چکا تھا جسے ”ایگز امز“ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ پسند نہیں کیا جاتا۔ تو ایگز امز کے دنوں کی ایک کیل ہی ایسی کاپی نہیں ہے اور بھی مختلف کاپیاں ہیں۔

”اچھا؟ تم تو بڑے کام کی ہو پھر۔ تم وائٹ ہاؤس کے سامنے ایک گھر کیوں نہیں لے لیتیں۔ روس کے تھوڑے حساب کتاب باقی ہیں امریکہ کے ساتھ۔ تم وہ حساب کتاب کیوں برابر نہیں کروا دیتیں ہمارے۔؟ اگر تم واقعی ویسی ہی ہو تو ج تم ہمارے بہت کام کی ہو۔ ہمارا حساب چکا چکو تو روس آنا۔ گارڈ آف آنر دیا جائے گا تمہیں۔“

”گارڈ آف آنر!؟“ امرچہ ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔ اس کی نحوست کو گارڈ آف آنر۔ کمال ہو گیا۔

”یہ میری زندگی کا بہترین وقت ہے ویرا۔ تم ہو میں ہوں برف ہے، مائچسٹر ہے اور تمہاری سائیکل ہے۔ میرے لیے اتنے خزانے تھے زندگی کے پاس۔“

”سب سے بڑا خزانہ کارل۔ ہا ہا ہا! ہنستے ہنستے ویرا سائیکل گرا بیٹھی دونوں سڑک پر گر گئیں۔ انہیں ہلکی سی چوٹ بھی آئی لیکن اس چوٹ کی پرواہ کسے تھی وہ دونوں تو سڑک پر گری سائیکل کے پاس ہنسنے میں مصروف تھیں۔

”اس کا نام لیتے ہی ہم گر گئے اف، اصل میں منحوس تو کارل ہے۔“

امرحہ کو بڑی خوشی ہوئی کارل کو منحوس ثابت کر کے اس نے جیسے اپنے منحوس ہونے کا بدلہ کارل سے لے لیا اور ساری روشن خیالی کے باوجود وہ دادی کی طرح پورا زور لگا کر کارل کو ”منحوس“ ثابت کرنے کے لیے تیار تھی۔ بلکہ اس کام کے لیے پارٹ ٹائم کرنے کے لیے بھی تیار تھی۔ ساری یونیورسٹی امرچہ کے خاندان کی طرح جب اسے منحوس منحوس کہا کرے گی تو امرچہ کے اندر ٹھنڈک ہی ٹھنڈک پھیل جائے گی۔

آہ۔ کاش یہ دن دیکھنا امرچہ کے نصیب میں ہو۔ کاش یہ دن جلد ہی آجائے۔ بلکہ آنے ہی والا ہو۔

”کارل دی منحوس مارا۔“

”میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟“ اپنے فیشن اور لمبائت کے لیے مشہور لنڈا۔

”تم چار پانچ مہینے پہلے لا بیرری آئی ہوگی۔“

”ہاں آئی تو تھی۔ ایک میگزین چاہیے تھا۔ پر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”سارا سمسٹر چھوڑ کر صرف امتحانات کے دنوں میں لا بیرری آنے والے مجھ سے ہی کہتے ہیں ”آپ کو کہیں دیکھا ہے۔“ دوسرے سمسٹر کے امتحانات میں آکر بھی تم ہی کہو گی۔ میں تھک جاتا ہوں بار بار اس سوال کا جواب دے دے کر اس لیے ابھی سے جتا رہا ہوں میں لا بیرری میں ہوں اور میں لا بیرری میں دیکھا اور پایا جاتا ہوں۔“

آنکھ ٹپکان، زبان داغ، خاص کر بالوں میں سے طوطے کیسے اڑتے ہیں کبھی دیکھا ہے۔

”نہیں۔ مائچسٹر یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس سے امتحانات کے دنوں میں نہیں۔“

”آئی لو یونی میوزیم۔“ ایما۔ عام دن۔

”میوزیم۔۔۔ یونی میں میوزیم ہے؟“ ایما۔

امتحانات کے دن۔

”اوہ۔۔۔ ٹیکسٹر کو کیا ضرورت تھی اتنا کچھ لکھنے کی۔ ایک آدھ ڈرامہ کافی نہیں تھا۔“ جو ناٹھن 40٪

بمبشکل لینے والوں میں سے۔

”کون ٹیکسٹر؟“ ڈنشل مائچسٹر کے ہر کلب اور بار کے بارے میں جاننے والوں اور 40٪ کے خواب دیکھنے والوں میں سے۔

”میرے چچا۔“ جو ناٹھن غصے میں۔

”تمہارے چچا ڈرامے لکھتے ہیں۔؟ کس تھیٹر میں لگتے ہیں ان کے ڈرامے۔ دو ٹکٹیں مل جائیں گی؟“

ایک اور۔

”تم ڈبہ کیوں کھا رہے ہو؟“ لوک ہاؤس ہال میٹ

”میں تو پڑا کھا رہا ہوں۔“ بے حد لائق فائق ملباسا پٹلا سا اسٹوڈنٹ کرس۔

”تم پڑا۔۔۔ ڈبہ سمیت کیوں کھا رہے ہو؟“

”نہیں! میں تو صرف پڑا کھا رہا ہوں۔ یہ دیکھو۔۔۔ اوہ۔۔۔ میری پلیٹ میں یہ ڈبہ کہاں سے آگیا۔؟“

گول گول چشمہ ملفوف آنکھیں باہر کو۔

”تمہارے منہ میں بھی ڈبہ کا کچھ حصہ ہے۔ اور خدا کے لیے کرس اس کھڑکی کو بند کر لو تم اوک ہاؤس کے وہ واحد اسٹوڈنٹ ہو گے جو اتنی ٹھنڈ میں کھڑکی کھول کر پڑھ رہا ہے۔“

”کھڑکی۔۔۔ اوہ۔۔۔ تو یہ کھڑکی ہے۔ میں بھی سوچ رہا تھا، میرے سارے کپڑے کہاں گئے۔ اور میرے جوتے بھی۔“

لا بیرری کی طرف جاتے ہوئے۔

”ہائے۔ جینا کیسی ہو؟“ مائیکل کیمسٹری اسٹوڈنٹ

”میں ماریا ہوں۔“ بائیو اسٹوڈنٹ۔

”جینا ماریہ نا۔۔۔؟“ ہارنہ مانتے ہوئے سر کھجاتے ہوئے۔

”ماریہ ایڈم!۔“ دونوں ہونٹوں کو بگاڑتے ہوئے۔

”ہاں! ہاں وہی جو کم لارین P13 (پیش قیمت کار) میں آئی ہے۔“

”میری تیسری نسل میں سے شاید کوئی کم لارین خرید کر اسے ہاتھ لگا سکے، میں ایسی جرات فی الحال نہیں کر سکی، میری حیثیت فری بس سے آنے والی ہے۔۔۔ اور تم؟“

”میں۔۔۔؟“ سر کھجاتے ہوئے ہی۔

”ہاں تم۔۔۔“

”مطلب۔۔۔ میں کہاں جا رہا ہوں۔۔۔ میں پڑھنے لا بیرری جا رہا ہوں سارا۔“

”ماریہ۔۔۔ مطلب تم کون ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

سر کھجانے کی باری اب ماریہ نے اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔

”میں اچھا بائے۔۔۔ میں لیٹ ہو رہا ہوں سوزین۔“ چلا جاتا ہے۔

”میں کون ہوں۔ کیا نام ہے میرا؟“ جاتے ہوئے۔

”تمہیں تو لا بیرری جانا تھا نا؟“ ماریہ پیچھے سے



چلاتی ہے۔

”تم یونیورسٹی سے باہر کی سمت جا رہے ہو۔“  
 ”تو تعلیمی دور میں کم سے کم دس بار ہم یہ ضرور سوچتے پائے جاتے ہیں کہ امتحانات میں فیل ہونا اتنا آسان اور پاس ہونا اتنا مشکل کیوں ہے؟ اسی فیصد پرچے اسی ایک لیکچر باب سوال پر کیوں مشتمل ہوتے ہیں جو آپ مس کر چکے ہوتے ہیں۔؟“  
 ”فیل ہونے کی بڑی وجہ کیا ہے؟“

”میرا خیال ہے یہ امتحانات ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

”Night before exams is like a night before christmas, you can't sleep and yet hope for a miracle“

اسٹوڈنٹس اپنے تعلیمی دور میں معجزات پر بہت یقین رکھتے ہیں اور ان کے رونما ہونے کی بھی دعائیں کرتے ہیں۔ دوسرا اور تیسرا باب پڑھنے کے بعد وہ یہ دعا کرتے سوجاتے ہیں کہ چوتھے پانچویں اور چھٹے باب میں سے کوئی سوال نہ آئے۔ اور سارا پرچہ دوسرے اور تیسرے باب پر مبنی ہو۔ چلو فرض کیا اگر چھٹے باب سے کچھ آئی گیا تو اسی فیصد دوسرے اور تیسرے ابواب سے جو آئے گا وہ پاس کروادے گا۔ چلو پچاس فیصد ہی سہی۔ چلو چالیس ہی سہی، اچھا چلو تیس ہی سہی۔ بس بہت ہے معجزاتی دعائیں۔ معجزاتی توقعات۔

امتحانات کے دوران سب سے زیادہ اسٹوڈنٹس خوش فہم ہوتے ہیں۔ امتحانات کے بعد سب سے زیادہ دنیا بھر میں دعائیں اسٹوڈنٹس کرتے ہیں۔

سب سے زیادہ خون امتحان نامی بلا چوستی ہے اور کوئی پھاندتی حقیقی موت رزلٹ کے دن سب سے زیادہ دکھائی دیتی ہے۔

جی ہاں۔ سچ ہے یہ۔  
 امتحان گاہ کے آخری پانچ منٹ میں ہر اسٹوڈنٹ مافوق الفطرت طاقت کا مالک بن جاتا ہے۔ وہ ساری

کتاب لکھ ڈالنا چاہتا ہے۔ لیکن وقت ہی نہیں ہوتا۔ اور ایک بڑی دردناک حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ یاد بھی آخری منٹوں میں آتا ہے امتحانات ایک لمحے آتے۔

”میں نے سارا سمسٹر ٹھیک سے کیوں نہ پڑھا؟“  
 ایک سوال، محاسبہ اور پچھتاوا جو امتحانات کے ختم ہوتے ہی اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔ ویسے اسے مرنے جانا چاہیے، ہمیشہ کے لیے۔ ایویں ذہن میں کلبلا کر احساس زیاں جاگتا ہے۔

”مجھے تھوڑی سی دیر کے لیے سوجانا چاہیے۔“  
 میں پچھلے پچیس، تیس منٹ سے بڑھ رہا ہوں۔ آخر نیند پر بھی میرا حق ہے۔ ”ایک خواہش جس پر فوری عمل کیا جاتا ہے۔“

تو سب اسٹوڈنٹس اس سوال کا جواب جاننے سے قاصر ہیں کہ امتحانات میں اتنی نیند کہاں سے آجاتی ہے۔ بھوک اتنی کیوں لگنے لگتی ہے۔ ٹی وی، میسج، یوٹیوب، نیوٹر پہلے سے زیادہ دلچسپ کیوں لگتے ہیں۔ کتابوں کی پہچان مشکل کیوں ہو جاتی ہے۔ ویسے امتحانات سے پہلے پوسٹ ایگزامینز پلان کر لی گئی تھیں۔ جیسے کرشمے آنے سے پہلے کرشمے کے بعد دی اور لی جانے والی پارٹیز پلان کی گئی تھیں۔ کون کون آئے گا، پارٹی کہاں ہوگی، کیا کیا ہنگامہ برپا کرنا ہوگا۔ امتحانات کے ختم ہونے کی خوشی میں نہیں بلکہ امتحانات سے جان چھوٹ جانے کی خوشی میں۔ آس پاس کے سب ہی پارز، کلبیس، ریسٹورنٹس اس انتظار میں تھے کہ جلدی سے امتحانات شروع ہو کر ختم ہوں اور بے چارے اسٹوڈنٹس کچھ پارٹی شادی، مزے شہرے کریں۔ بے چارے اسٹوڈنٹس۔

تو یونیورسٹی میں کچھ اس قدر پڑھنے والے اسٹوڈنٹس بھی تھے۔  
 ”یہ بدبو کہاں سے آرہی ہے۔ شاید تم میں سے جب۔“  
 ”ناگ سکیڑتی جولی۔“  
 ”ہاں شاید۔“ کئی دنوں سے میں ٹھیک سے منہ نہیں دھو سکا۔ کپڑے بھی۔ دانت برش کرنے کا تو

بالکل وقت نہیں ملا۔ ایگزامینز ہونا۔ ”پیلے دانت نکال کر مسکرا کر کہا جانے والا تاریخی جملہ۔“ جی ہاں تاریخی ہی۔

”تمہاری شکل مارشل سے ملتی جلتی ہے۔“  
 ”میں مارشل ہی ہوں۔ پڑھ پڑھ کر ایسا ہو گیا ہوں۔“

”اور shurup (شٹ اپ کی جدید شکل) اس حالت میں گھر نہ چلے جانا۔ اپنی ڈی این اے رپورٹ بھی دکھائی تو بھی گھر والے گھر میں گھسنے نہیں دیں گے۔“

”آخر تم تیز تیز کیوں نہیں چل رہے۔ ہم یونیورسٹی سے لیٹ ہو رہے ہیں۔“  
 ”مجھ پر بہت بوجھ ہے گراہم!“

”پر تمہارے ہاتھ تو خالی ہیں۔“  
 ”میرے سر پر۔“

”تم نے تو آج ٹوپی بھی نہیں پہنی۔“  
 ”میرے ذہن پر یار۔! پڑھائی کا بہت بوجھ ہے۔ میں نے کچھ غیر ضروری کتابیں بھی پڑھ ڈالیں۔“  
 ”تمہیں یاد ہے نا تمہیں 100% میں سے مارکس لینے ہیں 1000% میں سے نہیں۔“  
 ”ہاں پھر بھی۔ پھر بھی میں نے سوچا شاید۔“

یہ صرف کچھ جھلکیاں ہیں امتحانات کے دنوں کی۔ اور ظاہر ہے اسٹوڈنٹ دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھتا ہو۔ کم و بیش ایک سی حالت سے گزرتا ہے۔ ایک جیسے احساسات کا مالک ہوتا ہے کیونکہ وہ بے چارہ اسٹوڈنٹ ہوتا ہے نا۔ بے چارہ۔

یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹس کی ایک خاص تعداد Modafinil اسٹڈی ڈوز بھی لیتی ہے۔ جسے کھا کر اسٹوڈنٹس کے بقول وہ بنا تھکے اور بنا سوئے کئی گھنٹے آرام سے پڑھ سکتے ہیں۔ بہت سے اسٹوڈنٹس دوائیں، ٹونک بھی لیتے ہیں۔ دیواروں پر نوٹس چپکاتے ہیں پڑھنے سے متعلق اکثر اسٹوڈنٹس کے کمرے کی دیواریں ان نوٹس سے بھری ہوتی ہیں پھر

کہیں جا کر ان کے 40% مارکس آتے ہیں۔ Unicorn ہر اسٹوڈنٹ کے ٹیبل پر رکھا نظر آنے لگتا ہے۔ ایگزامینز سے متعلق اقوال دیواروں پر چپکا دیے جاتے ہیں آئینے میں اپنی ہی شکل دیکھ کر ڈرا جانا ہے۔ اور رات کو جتنی منی سی نیند میں بھی کتابیں آکر ڈراتی ہیں۔

تو وہ وقت آچکا تھا جو نیندیں تو بلاشبہ بھگائے گا ہی، ساتھ تانیاں، داویاں اور پھوپھیاں بھی یاد کروا کر جائے گا یہ وہی دن ہوتے ہیں نا جب لگنے لگتا ہے کہ ایگزامینز سیزن زندگی سے کبھی جائے گا بھی۔ زندگی کبھی معمول پر بھی تھی۔ رات کو اپنی مرضی سے سونے والی، صبح آرام سے اٹھنے والی۔ پس ہانکنے والی ادھر ادھر گھوم پھر کر مستیاں کرنے والی۔ آکسفورڈ روڈ اور اس سے منسلک دوسری سڑکوں پر چل قدمی کرنے والی۔ اف کبھی اتنے فاسٹ رہے ہیں ہم۔ پرنٹ ورک میں بڑی بڑی میزوں پر اسنو کرکھیلنے والے، اوک ہاؤس کے گراؤنڈ میں آگ جلا کر اس کے گرد رات رات بھر بیٹھے رہنے والے۔ اتنے فاسٹ۔ کیا یہ سب ہونا رہا ہے۔ سچ؟

پروفیسرز اسٹوڈنٹس کو دیکھ کر زیر لب مسکرا دیتے، جیسے کہتے ہوں، اب چڑھے گا اصل فلو۔ لائبریری اسٹاف جن بھوت بن جائے کہ اصل امتحان تو اسٹوڈنٹس ان کا لینے والے تھے۔ جو نہیں بھی موجود ہو گا وہ بھی مانگا جائے گا۔

لائبریری اور لرننگ کامنز (پڑھنے کی جگہ) رات دن کھلے تھے اور کچھ ایسا سا پیدا کر رہے تھے جیسے وہاں عام انسان نہ ہوں، کسی سیارے سے اتری مشینی مخلوق ہو جو نہ کھاتی ہے نہ سوتی ہے بس پڑھتی ہی رہتی ہے۔ اگر ساری مائچسز لوٹی کو ایک دلہن مان لیا جائے تو۔

”Commanrs alan gilbert tearing“

المعروف علی لرننگ کامنز اس دلہن کے ماتھے کا جھومر قرار پائے۔ چار اطراف شیشے سے سجی، شیشے سے بنی اور بلڈنگ کے اندر بیٹھے آپ باہر کی دنیا سے لا



تعلق نہیں رہتے۔ کسی ارب پتی کے ذاتی گھر کی طرح بے حد نفیس اور صاف ستھرا۔ فائبر اسٹار ہوٹل کی طرح چمکتی دھمکتی گھر کے ماحول سے کہیں بڑھ کر آرام دہ اور پرسکون۔ نرم گرم علی کامنر۔

اسٹوڈنٹس اپنی مرضی سے اپنی تعلیم کے مطابق کامن روم کا انتخاب کر سکتے تھے۔ ہال میں بھی پڑھا جا سکتا ہے جہاں کئی دوسرے اسٹوڈنٹس پڑھنے میں مصروف ہوتے ہیں۔ گروپ میں بھی الگ سے گروپ روز میں بھی۔۔۔ دو دو چار چار کے گروپ میں بھی۔ یہاں ہر طرح کی سہولت موجود ہے، چارنگ، ایل سی ڈی، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، وائٹ بورڈ وغیرہ وغیرہ۔

پورے لرننگ کامن کی ڈیراننگ اور سجاوٹ ایسی ہے کہ گمان ہوتا ہے پڑھنے نہیں آئے۔ تفریح کے لیے کسی ہوٹل میں آئے ہیں۔ ساتھ ہی کیفے ہے۔ اسٹوڈنٹس لرننگ کامن میں آجائیں تو انہیں کسی دوسری ضرورت کے لیے باہر نہیں جانا پڑتا وہاں سب کچھ مہیا کر دیا گیا ہے۔

”تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے؟“ عالیان ہاتھ میں دو عدد کافی مک لیے اس کے سامنے بیٹھ چکا تھا۔ وہ اوپن ہال میں اکیلے بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ اسے ضرورت پڑی تھی تو وہ اپنی کسی کلاس فیلو سے مدد لینے چلی جاتی تھی۔

”تم بزنس کے اسٹوڈنٹ ہو اور میں انگلش لٹریچر کی۔۔۔ تم میری مدد کیسے کر سکتے ہو۔“ جی ایگز امر کے دنوں میں اسٹوڈنٹس چرچے بھی ہو جاتے ہیں۔

”جانتا ہوں۔۔۔ لیکن تمہارے سبجیکٹ میں ایک اسکول کا بچہ بھی تمہاری مدد کر سکتا ہے۔“ عالیان جیسے اسٹوڈنٹس کامن ماحول عروج پر ہوتا ہے۔

”تو وہ بچے اسکول کیوں جا رہے ہیں۔ یہاں آکر ماسٹرز کیوں نہیں کر لیتے؟“

عالیان نے قہقہے کو بلند ہونے سے روکا۔ کیا جواب دیا تھا امرحہ نے۔

”ان سب باتوں سے تمہارا مطلب کیا ہے؟“

امرحہ نے ہونٹ سکیڑے۔

”سیدھا اور صاف مطلب ہے، یہ بہت آسان سبجیکٹ ہے۔“

”تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔“ مزاج بگڑنے لگا تھا امرحہ کو نیند کی ضرورت تھی۔

”تمہیں بتا رہا ہوں۔“ عالیان بھرپور نیند لے کر آیا تھا، جسم پر بیٹھ گیا۔

”تم طنز کر رہے ہو۔“

”حقیقت کو تمہاری زبان میں طنز کیا جاتا ہے؟“ اس نے ذرا آگے ہو کر اس کے سامنے رکھی کتاب کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا تو امرحہ نے فوراً کتاب کو چھین لیا۔

”اف۔ اتنی بد تمیزی۔“ اس نے ایسے طنز کیا جیسے اس نے برا مان لیا ہے پھر بھی وہ مزید پھیل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

”کافی پی لو۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔“ ہنسی دبانے کے لیے اس نے ہونٹ کا کوٹا دانٹوں میں لیا۔

”کس نے کہا تھا میرے لیے کافی لانا کو؟“ اسٹوڈنٹس کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ٹوٹ لینے والی یہ کہہ رہی تھی۔ ٹھیک ہے آخر کار ہر انسان بدل ہی جاتا ہے۔

امرحہ کو یہ بات بری لگی تھی کہ اس نے اس کے مضمون کو لے کر ایسا کہا۔ دنیا میں ہر انسان نیوٹن اسٹیفن یا عبدالسلام نہیں بن سکتا، ذہانت کا معیار مشکل مضمون پڑھنا ہی نہیں۔ اگر ہر لڑکی مادام کیوری جیسی نہیں بنتی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کندہ بنے۔ یا صفر ہے۔

وہ لاء پڑھ کر مارگریٹ تھیچر آئزن لیڈی بن سکتی ہے۔ ایم اے اردو کر کے بانو قدسیہ بن سکتی ہے۔ معمولی سمجھے جانے والے مضامین کو پڑھ کر بھی وہ کیا نہیں کر سکتی۔

”مجھے الہام ہوا تھا۔“ وہ اس کے دے دے غصیلے انداز پر زیر لب مسکرا رہی تھی۔

باہر برف باری شروع ہو چکی تھی۔ دونوں قد آدم

لیٹی کھڑی کے پاس بیٹھے تھے۔

”برف باری ہو رہی ہے امرحہ! دیکھو۔“ اس کا مقصد صرف اس کا غصہ کم کرنا تھا۔ لیکن اگلی بات کر کے اس نے غلطی کی۔

”تم تو شاید پہلی بار دیکھ رہی ہو گی؟“ اس نے کھڑکی سے باہر آسمان سے اترتے روئی کے گالوں سے برف کے گولوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

امرحہ کا غصہ یک دم بڑھ گیا ”کیوں میں کیوں پہلی بار دیکھ رہی ہوں گی؟“

”ہمارے پاکستان میں سب سب۔۔۔ سب۔“ اس نے ایسے شانے لہرائے جیسے کہتی ہوئی انگریز۔ او

shurup۔

”برف باری بھی؟“ وہ ٹھوڑی کھجانے لگا پھر اس نے ہاتھ ٹھوڑی تلے ہی نکالیا۔ کرسس ٹائٹ برلارڈ میز اپنی پسندیدہ فلم دیکھتے ہوئے، اپنے قہقہے کا گلا دبانے ہوئے۔

”یونیورسٹی کی یادداشتیں ڈاٹ کام۔“

”ہاں بالکل۔“ شانے پھر اچکائے۔

سندری امرحہ مزے سے سچ کا گلا دباتے ہوئے، لارڈ میز کو کم عقل سمجھتے ہوئے کسی انداز میں ایسی لمبی چھوڑتے ہوئے ایک جھوٹ سوکھانیاں ڈاٹ کام۔

”لاہور میں برف باری ہوتی ہے امرحہ۔ اچھا۔۔۔ کب کب؟“

”جب جب یہاں ہوتی ہے۔“ امرحہ کے انداز کی نظر اتاری جانی چاہیے تھی۔

”اچھا۔۔۔ اور کیا لیا ہوتا ہے لاہور میں۔۔۔؟“

لارڈ میز نے ریموٹ پھینک دیا ہے، انہیں صرف یہی فلم دیکھنی ہے۔

”سب۔۔۔ سب۔۔۔ جو یہاں بھی نہیں ہے سب ہے وہاں۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ پھول، پودے، اسکول، کالج، یونیورسٹیاں، عجائب گھر، بڑے بڑے بازار، شاپنگ سنٹر، ہوٹلز، سپر جنرل اسٹورز، ٹرین، موٹروے، بڑی بڑی سڑکیں، سب ہے ہمارے پاس۔ تم نے کیا سمجھ رکھا ہے نہیں۔“

وہ اتنی دلچسپی اور محویت سے اسے دیکھ رہا تھا جیسے چھوٹے بڑے سب ٹام اینڈ جیری دیکھتے ہیں۔ اس کے مدلل انداز۔

”تم نے کیا سمجھ رکھا ہے ہمیں؟“ انداز کچھ ایسا تھا جیسے عدالت میں جج کا ہوتا ہے۔

”بتاؤ جوزف تم نے قتل کیوں کیا۔ کیوں کیا۔۔۔ جواب دو۔۔۔ ٹھہرو۔۔۔ سزا کے لیے تیار ہو جاؤ۔۔۔ الیکٹرک چیر تمہارا مقدر ہے۔ ہاں تمہارا مقدر۔“

”لاہور میں سب نہیں ہے امرحہ! سب کچھ تو مانچسٹر میں ہے۔“ مسکراہٹوں میں سب سے پیاری مسکراہٹ سجا کر عالیان نے کہا۔

”ہاں تم تو یہی کہو گے۔“ سندری امرحہ نے بروں میں سب سے بری طرح منہ بنا کر کہا۔

”میں۔۔۔ ہاں میں ہی تو یہ کہوں گا۔۔۔ لاہور خالی ہو چکا ہے۔ اس کے پاس سب نہیں ہے۔ تم تو یہاں بیٹھی ہو۔ اس کے پاس سب کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔ اس کا سب تو مانچسٹر میں آچکا ہے۔“

کھڑکی کے باہر گرتے برف کے گالوں نے اتنی پیاری بات پر تالیاں بجائیں۔۔۔ وہ سفید سے نیلے، نیلے، ہرے ہو گئے۔ اور امرحہ خاموش ہو گئی اور کتاب پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔

”ویسے یہ دیکھو۔“ اس نے اپنا موبائل امرحہ کے آگے کیا جہاں لاہور کے موسم کی ساٹھ سالہ تاریخ موجود تھی۔

”لاہور میں برف باری نہیں ہوتی۔“ کہہ کر اس نے بلند قہقہہ لگایا۔ اس بار اس نے آواز دھیمی رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ اوھر اوھر بیٹھے اسٹوڈنٹس نے اس کی طرف دیکھا کہ اتنے دباؤ میں بھی کون ایسے دل سے ہنس رہا ہے۔ عالیان۔۔۔ اور کون۔۔۔

”ہوتی ہے۔“ وہ اپنی بات پر قائم رہی۔

”سندری امرحہ۔۔۔ سچ سچ۔۔۔ لاہور کی پتنگیں اور گپوں کی نہ ختم ہونے والی ڈوریں۔“ لاہور کی تاریخ اور رنگیلے لوگوں سے اکساب۔



عالیان نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔  
”اور یہ سب؟“ اس نے موبائل پر نظر آنے والے کالم کی طرف اشارہ کیا جو لاہور کے موسم کے بارے میں تھا۔

”یہ غلط ہے۔ کسی جھوٹے انسان نے لکھا ہے۔“ اس بار امجد نے شانے اور گردن ایک ساتھ اچکائے اور اتنے یقین اور سنجیدگی سے کہا کہ عالیاں کا جی چاہا کہ کہہ دے کہ ہاں ساری دنیا جھوٹی ہے غلط ہے۔ صرف تم سچی ہو۔ مجھے صرف تمہاری بات پر یقین ہے۔ لیڈی مہر کی طرح ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر وہ اپنی مزید مسکراہٹ دہائے اسے دیکھتا رہا۔  
دونوں کے درمیان کچھ دیر خاموشی رہی۔

سندری امجد ایسے ہی جھوٹ بولتی جا میں اور لارڈ میز ایسے ہی سنتے جا میں۔ وہاں کچھ ایسا ماحول تھا۔ علی رنگ کے اوپن ہال میں۔ کھڑکی کے پاس۔  
”اگر میں لاہور جا کر رہوں اور برف باری نہ ہو تو تم مجھے کہو گی کہ اس سال ہی نہیں ہوئی۔ اگر میں اگلے سال تک کے لیے لاہور میں رک جاؤں تو تم کہو گی کہ موسم میں خطرناک حد تک تبدیلی آچکی ہے۔ اور اگر میں آس پاس کے لوگوں سے تصدیق کے لیے پوچھنا شروع کر دوں تو تم کہو گی کہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔ تمہاری بے عزتی کروانا چاہتے ہیں۔“ اپنی ساری ہمت مجتمع کر کے اپنی ہنسی کو اندر ہی روک کر وہ بمشکل اتنا ہی کہہ پایا۔  
”تو تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو کہ سب کچھ تمہارے پاس ہی ہے؟“

وہ ہنسا ”تم دو شہروں کے سرسری جائزے میں بھی حاسد ہو امجد۔ میں نے یہ کب کہا کہ ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ میں نے صرف اتنا کہا کہ کیا تم پہلی بار برف باری دیکھ رہی ہو۔ بس تم برا مان گئیں۔“  
”میں بہت یاد دیکھ چکی ہوں۔ بس۔“ امجد باز آنے والی نہیں تھی۔

”ٹھیک ہے پر کہاں؟“  
”فلموں میں۔ لی وی پر۔“ میگزینز میں۔“ اس

نے روانی سے کہا۔  
عالیاں نے سر کو اٹھایا۔ علی رنگ کی چھت کو دیکھا اور اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ ہال میں موجود ذرا زیادہ فاصلے پر موجود اسٹوڈنٹس بھی سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگے اور قریب کی نشستوں پر ذرا دیر کو اوٹکھٹنے والے اسٹوڈنٹس ڈر کر ’جھرجھری بھر کر چونک کر آس پاس دیکھنے لگے۔  
”عالیاں!“ ڈر کر اٹھ جانے والی میمن نے اسے گھورا۔

عالیاں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ امجد خاموشی سے کتاب پڑھنے لگی کہ وہ چلا جائے لیکن اپنی ہنسی قابو میں کرنے کے بعد وہ اس کی ایک کتاب لے کر بیٹھ گیا اور اسے سرسری دیکھنے لگا۔ وہ کتاب کا ایک صفحہ الٹا اور اسے دیکھتا۔ پھر اسے دیکھا اور جلدی سے صفحہ الٹ دیتا۔ وہ غیر ارادی طور پر اس کے مزاج کو بگاڑ چکا تھا۔  
”تمہاری آنکھیں۔“

”میری آنکھیں کیا۔“ امجد کو یقین تھا اب وہ اس کی آنکھوں کو نشانہ بنائے گا۔ کالی۔ گہری۔  
”مجھے بھوری آنکھیں پسند نہیں۔“ اس نے جلدی سے اسے ٹوک دیا۔  
”میں نے تم سے اپنی آنکھوں کے بارے میں تو نہیں پوچھا۔“

”تم میری آنکھوں کو برا کہتے میں نے پہلے ہی کہہ دیا۔“ کیا حکمت عملی اپنائی تھی امجد نے۔ واہ۔  
”میں نے تمہیں برا کہا؟“

”کہہ سکتے تھے۔ امکانات تھے۔“ کافی ذہین تھی امجد ویسے۔ باوام کھاتی رہی تھی نا۔  
”جب کہا ہی نہیں تو۔“

”کہہ دیتے تو۔“  
”میں تو بس اتنا کہنے لگا تھا کہ تمہاری آنکھیں بہت گہری ہیں۔ جب تمہیں پہلی بار روتے ہوئے دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ بہت آنسو بہا چکی ہیں بہت روتی رہی ہیں۔“

نوٹس لکھتے امجد کے ہاتھ رک گئے۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اسے اس سے خوف محسوس ہوا۔ وہ اس کے بارے میں اور کس کس بات کا ایسے ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا چکا تھا۔ اس کی نحوست کا بھی۔ کیا اس کا بھی کہ لاہور میں وہ کتنی غیر اہم رہی ہے۔ گھر کا خاندان کا حصہ ہو کر بھی حصہ نہیں سمجھی گئی۔ اس پر کیسے کیسے طنز کیے جاتے رہے ہیں۔ اس کا کیسے کیسے مذاق اڑایا جاتا رہا ہے۔

وہ امجد جو رات کے اس وقت بارہ بجے کے قریب مکمل اعتماد سے علی رنگ کا من میں بیٹھی بڑھ رہی ہے، دادا کے کمرے میں خوف سے چھپ جا رہی تھی کہ گھر میں آنے والے مہمان اسے دیکھ نہ لیں۔ اگر وہ کسی تقریب میں چلی ہی جاتی تو کوئی ایسی جگہ تلاش کر لی جہاں کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ وہ اپنے ہم عمروں کو باتیں کرتے، قہقہے لگاتے، اچھل کود کرتے دیکھتی لیکن اپنی جگہ سے نہ ہلتی۔ ان کے پاس جانے کی ہمت نہ لگتی تھی۔

”کیوں روتی رہی ہو تم؟“  
”میں کبھی نہیں روتی۔“ کس قدر خوفناک سوال پوچھ لیا تھا عالیاں نے۔ وہ اس سوال کا جواب کبھی نہیں دے گی۔

”یہ جھوٹ ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔  
”میں کبھی نہیں روتی۔“ کہانا۔  
”جو کبھی نہیں روتا وہ انسان نہیں ہوتا۔ تم انسان نہیں ہو کیا؟“

”تم انسان ہو۔ تم روتے ہو؟“  
”ہاں! رویا ہوں، بہت رویا ہوں۔“ خاموشی کے بوجھل وقفے کے بعد وہ بولا۔ اس کی آواز اداس ہو گئی۔ وہ پہلی بار اتنا اداس نظر آیا۔

”کیوں؟“ امجد کو اپنی غلطی کا فوری احساس ہوا۔ خاموشی سے وہ جیسے سر جھکا کر بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔  
”دیکھا برا لگتاں۔“ اپنے رونے کی وجہ کوئی بھی بتانا پسند نہیں کرتا۔  
”میں چھ سال کا تھا جب رات بھر اپنے ہاتھ کو اپنی

ماما کے ہاتھ میں دیر ان کے سرہانے بیٹھا رہا تھا۔ صبح ان کا ہاتھ سرد ہو چکا تھا اور سخت بھی۔ اور جب لوگوں نے میرے ہاتھ کو ان کے ہاتھ سے نکالنے کی کوشش کی تب میں رونے لگا۔ اور بعد میں بھی اس منظر کو یاد کر کے روتا رہا۔ یہ میرے اب تک کے رونے کی سب سے بڑی وجہ ہے۔“  
امجد کو اپنے رویے پر شرمندگی ہوئی۔ ”آئی ایم سوری۔“

وہ اٹھا اور چلا گیا۔ اس کی چال بتا رہی تھی کہ وہ خود کو کس کیفیت سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے۔ امجد نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کا اپنے بارے میں اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ وہ کافی خود غرض ہوتی جا رہی تھی۔ غالباً ”ٹھیک کہہ گیا تھا کہ جو روتا نہیں وہ تو انسان ہی نہیں ہے۔ اور سب انسان روتے ہیں۔“ کبھی نہ کبھی۔ کسی نہ کسی وجہ کو لے کر۔

لیڈی مہر اپنے بچوں کے بارے میں صرف اس محبت کا ذکر کرتی تھیں جو ان سب کے درمیان تھی۔ وہ کبھی یہ نہیں بتاتی تھیں کہ کون کیا، کیوں اور کیسے ہے۔ وہ اس کنڈر سینٹر تک کیسے پہنچا۔ اس کا ماضی کیا ہے۔ وہ کہا کرتیں ”ان کے بچوں کا ماضی کتنا بھی بھیا تک رہا ہو، ان کا حال پر عزم ہے اور مستقبل شان دار۔ وہ ان کے بچے تھے اور وہ ان کی تکلیفوں کو ان کے سوا کسی اور کے ساتھ زیر بحث نہیں لائی تھیں۔ کبھی مورگن، شارلٹ، ڈینس یا کوئی اور ان کے پاس پریشان صورت لیے آتا تو گھنٹوں گم رہے کہ اسے بچے یا بچی کو لیے جانے کون کون سی باتیں کرتی رہتیں۔ امجد سمجھ سکتی تھی کہ آپ کتنے بھی مضبوط اور بہادر بننے کی کوشش کریں۔ ماضی سامنے آکر تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی پر دوا نہ سا ضرور کر دیتا ہے۔ آپ اپنے حواس کھونے لگتے ہیں۔“ عالیاں کے بارے میں اگر امجد نے کچھ جانتا چاہا تو انہوں نے صرف اتنا کہا۔

”وہ میرا بہت بہادر بیٹا ہے اور اپنی ماں مار گریٹ سے مثالی محبت کرتا ہے۔“



ہوئی۔ وہ تھوڑی دیر کو کھڑی کی کھڑی رہ جاتی۔  
”کیا یہ کسی خواب کا منظر ہے۔ یا خواب ہی ہے؟“

اسٹوڈنٹس تیزی سے آ جا رہے ہوتے۔ غلے، پیلے، سرمئی، کالے، سفید کوٹوں والے، ٹوپوں والے، منہ سے بھاپ نکالتے۔ ہاتھوں کو رگڑتے یا جیبوں میں دیے کٹے پیارے مناظر تھے۔ ٹھنڈ تھی۔ برف تھی۔ دھند تھی۔ اور آزادی تھی۔

دوست تھے۔ ہلا گلا تھا۔ اور کوئی دکھ نہ تھا۔ دو دن بعد امرہ تھوڑا سا وقت نکال سکی عالیان کے پاس جانے کے لیے، علی رنگ کامن کے گروپ اسٹڈی روم کے شیشے کے دروازے کے بارہ اسے نظر آ گیا۔ کم سے کم گیارہ اور اسٹوڈنٹس بیٹھے تھے اور وہ وائٹ بورڈ کے پاس کھڑا لیکچر سارے رہا تھا۔ پین سے وہ وائٹ پر کوئی سوال حل کر رہا تھا۔ امرہ نے اس کے لیے کافی لی تھی اب اتنے اسٹوڈنٹس میں وہ ایک مک کافی تو نہیں دے سکتی تھی، اس لیے پلٹ آئی۔ وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہی تھی جب عالیان تقریباً اس کے پیچھے بھاگتا ہوا آیا۔

”یہ میرے لیے لائی ہو۔“ اس نے مک پکڑ کر گھونٹ بھرا۔

”ہاں!“ وہ مک ہاتھ میں لے چکا تھا۔ کافی پی رہا تھا اور پوچھ رہا تھا امرہ نے اسے داد دی۔

”مفت!“ وہ سیڑھیاں اترنے لگا اس کے ہال کی طرف بڑھنے لگا۔

”ظاہر ہے مفت۔ یہ ٹوٹ نہیں ہے۔“

”اوہ شکر کہ یہ ٹوٹ نہیں ہے۔ ویسے ہی میرے سر پر دس بارہ ٹوٹیں ہیں۔ چار تو کارل کی ہیں۔ اور وہ میری جان کو آیا ہوا ہے۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں آئی ہوں؟“

”دونوں سے انتظار کر رہا تھا تمہارا۔“ چلتے چلتے اس نے گردن موڑ کر کہا۔

”ہر میں نے کب کہا تھا۔ میں آؤں گی؟“

”آنا چاہیے تھا۔“

بس اس سے آگے انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ ایک سمجھ دار خاتون تھیں۔ انہیں معلوم تھا کس کے بارے میں کتنی بات کرنی ہے اور اپنے بچوں کے لیے تو وہ بہت سمجھ دار تھیں۔

امرہ اپنے رونے کو لے کر بیٹھی تھی اور سمجھتی تھی۔ اس سے زیادہ دکھ کسی کو ملے ہی نہیں۔ اس سے زیادہ زیادتی زندگی نے کسی کے ساتھ کی ہی نہیں۔ قدرت نے سب عم کے ہاڑ اسی پر توڑ ڈالے ہیں۔ کسی خوشی کا حق دار اسے ٹھہرایا ہی نہیں گیا۔ ایک امرہ ہی گیا۔ ہم سب یہی سوچتے اور اسی سوچ پر یقین رکھتے ہیں۔

انسان نے سب سے زیادہ علم جو خود کو سکھایا ہے وہ ناشکر گزاری اور شکوہ سرائی ہی تو ہے۔

\*\*\*

سبز باغیچہ پر برف سے اٹ چکی تھی۔ برف پر دی نظر آئی تھی، پہلی بار برف کے ایسے ڈھیروں کو دیکھنے والوں کا جی چاہتا تھا کہ وہ ان ڈھیروں پر پھسلیں، گولے بنا بنا ایک دوسرے کو ماریں۔ اور بہت سے اسٹوڈنٹس وقت نکال کر ایسا کر بھی لیتے تھے۔ باغیچہ پر سفید پری کا راج تھا اور گرم خطوں سے تعلق رکھنے والے اس سفید پری پر فدا ہوئے جا رہے تھے جبکہ ٹھنڈے خطوں کے باشندے ایسے موسم سے بہت چڑتے ہیں۔ وہ ہمارے دلدادہ ہوتے ہیں کم نہیں منہ سے بھاپ نکالتے اس موسم سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ اتنے ڈھیر سارے گرم کپڑے پہننے سے انہیں کوفت ہوتی ہے۔ پاکستانیوں کی تو خیر جان ہوتی ہے سردیوں میں۔ اور وہ سردیوں کے مختصر دورانیے کو ایسے مناتے ہیں جیسے مغربی کرسمس کی چھٹیوں کو۔ دستانے، ٹوپی چڑھانے، کانوں کے گرد مفلر لپیٹے، گرم کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیے۔ سرخ ناگ لیے۔ دھند کو اپنے اندر اتارتے دھند کو چیرتے چلتے امرہ یونیورسٹی میں آتے ہی مہو سی ہو جاتی۔ دھند یونیورسٹی کی عمارتوں سے ہوتی زمین پر اتر رہی

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ امرہ کو نیچے جانا تھا اسے تو نہیں نا۔

”میں تمہارے ساتھ۔“

”میرے ساتھ کیوں آ رہے ہو۔ تم پر ہوا بلکہ شاید تم کوئی لیکچر دے رہے تھے۔“

”میں بریک لینے کے بارے میں سوچ رہی رہا تھا۔“

”میں تو صرف معذرت کرنے آئی تھی تم سے۔“

دونوں سینکڑوں فلور پر آ کر رک چکے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ کرو۔“

امرہ اس کامنہ دیکھنے لگی۔

”کرو بھی۔ میں سن رہا ہوں۔“ کافی کی چسکی لے کر اس نے کہا۔

”معذرت کرنے آئی تھی۔ جب یہ کہہ دیا تو مطلب معذرت کر لی۔ اور کیا۔“

”آں۔ اچھا۔ اب آگے۔“

”آگے کیا؟“ امرہ کو پھر سے غصہ آنے لگا۔

”تم اتنے پیارے سرد باغیچہ میں رہ کر اتنی جلدی گرم کیوں ہو جاتی ہو؟“ عالیان مسکرایا یعنی امرہ سے ناراض ہونا وہ جانتا ہی نہیں تھا۔ اس کے غصے کو وہ پھول کی پتی کی مانند چھو کر اڑاتا تھا۔

”اچھا چلو، آئیز امز کے بعد ملتے ہیں۔ مشکل ہے لیکن میں کر لوں گا۔ ورنہ میرا تعلیمی ریکارڈ خراب ہو جائے گا۔“

”مجھے تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔“

”مجھے خود بھی میری باتیں سمجھ نہیں آتیں۔“

”اچھا تم جاؤ۔“

”کیسے انسان ہو تم، کسے جانے کے لیے کہہ رہے ہو۔“ کارل کی آواز ان کے قریب، لیکن پیچھے سے آئی اور اس نے بڑھ کر عالیان کی گردن دیوچ لی۔

امرہ تو فوراً وہاں سے غائب ہو گئی وہ امتحانات کے دنوں میں اس سے کوئی لڑائی مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اگلی رات کو وہ خود امرہ کے پاس آیا۔

کچھ فاصلے پر بیٹھی لیزا پڑھتے پڑھتے لڑھک کر سو چکی تھی اور صوفے اور کارپٹ کے درمیان جھولتی

کافی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ پہلے تو اسے دیکھ دیکھ کر امرہ اپنی ہنسی روکتی رہی پھر اس کے پاس آئی اسے دھکیل کر کارپٹ پر کیا تاکہ وہ ٹھیک سے کارپٹ پر ہی سو جائے۔ سامنے اس کا لیپ ٹاپ کھلا رکھا تھا۔ اکثر ایسی چیزیں غائب کر لیے جاتے۔ کے واقعات ہو جاتے تھے۔ امرہ نے اس کی چیزیں سینٹیں اور بیگ کو اس کے سر کے پیچھے رکھا۔ ابھی لیپ ٹاپ پر اس نے ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اسے محسوس ہوا کہ اس کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ اس نے گردن موڑی تو کارل کھڑا تھا۔

”امرہ The Lost Duck علی لرننگ کامن میں سوئے ہوئے اسٹوڈنٹس کی چیزیں چراتے ہوئے۔ اپنی نوعیت کا چالیسواں واقعہ۔“ فون ہاتھ میں لیے وہ مسکرا رہا تھا۔ ”یہ گرما گرم خبر کچھ ہی دیر میں The Tab Manchester (اسٹوڈنٹس ویب سائٹ) میں آجائے گی۔“

امرہ کا جی چاہا کہ لیزا کی ٹھنڈی ہو چکی کافی اس پر انڈیل دے، پر وہ باز رہی۔ وہ اپنی آنکھوں کی چنگاریاں دبائے اسے گھور رہی تھی اور کارل کو یہ نظر آ رہا تھا کہ اسے گھورا جا رہا ہے۔ وہ ہاتھ باندھ کر ایسے کھڑا ہو گیا جیسے سوو سو پیارا رازی اس کی تصویریں کھینچ رہے ہوں۔

”تمہیں غصہ آ رہا ہے؟۔ ہاں تمہیں تو غصہ آ رہا ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”میں عالیان سے کہتی ہوں۔“ امرہ کو آگ ہی لگ گئی۔

وہ ہنسا ”عالیان میرا باپ نہیں ہے ویسے ہوتا تو بھی وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا یہ دھمکی چلنے والی نہیں تھی کہ میں تمہاری اماں سے تمہارے ابا سے تمہاری شکایت کروں گی یا ذرا رو میں ابھی اپنے بھائی کو لے کر آئی وہ تمہاری عقل ٹھکانے لگائے گا۔

”کچھ ہی دیر میں تم یونی میں مشہور ہو جاؤ گی پھر ہر کوئی تم سے اپنی چوری شدہ چیزوں کا مطالبہ کرے گا

کوئی تم سے اپنی چوری شدہ چیزوں کا مطالبہ کرے گا



وہ بھی جن کی کبھی ایک پن بھی چوری نہیں ہوتی ہو گی۔ تم سوچ سکتی ہو میرا کیا مطلب ہے۔“ اف وہ پھر مسکرایا۔ گنداپہ۔

امرحہ کارل کو وہیں چھوڑ کر ویرا کے پاس آئی۔ وہ اپنی کلاس فیلوز کے ساتھ گروپ اسٹڈی کر رہی تھی۔ ویرا کو ساری بات بتائی۔ ویرا ہنسنے لگی۔

”تم فکر نہ کرو۔ وہ تمہیں ڈرا رہا ہے۔ ویسے میں The Tab کے ایڈیٹر کو جانتی ہوں۔ بات کر لیتی ہوں اس سے۔ تم فکر نہ کرو۔“

ویرا نے قہقہہ لگایا۔ ”ویسے ایسا کر کے دیکھتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ چور کیسا محسوس کرتے ہیں۔“

ویرا ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگی۔ ”ایسی باتیں کرتی تم بڑی پیاری لگتی ہو۔ اگر اگلے جنم نام کی کوئی چیز سے تو مجھے امرحہ بننا ہے۔ یگ لیڈی آف پاکستان۔“

ویرا نے وہیں کھڑے کھڑے ایڈیٹر سے بات کی کچھ دیر بعد ویرا نے ایم ایم ایس جو ایڈیٹر نے اسے بھیجا تھا۔ امرحہ کو دکھایا۔ وہ امرحہ کی تصویر تھی۔

”جادو سے پنا تاز کر کے اسٹوڈنٹس کی چیزیں چھپا دینے والی فریئر امرحہ (The Lost Duck) اپنی نوعیت کا چالیسواں واقعہ، یونیورسٹی انتظامیہ سے تحقیقات کی گزارش کی جاتی ہے۔“

وہ تمہیں چور نہیں جادو گر ثابت کر رہا ہے۔ تم دیکھتیں، کل تک تمہارے پاس اسٹوڈنٹس کی لائن لگ جاتی پنا ٹیرم کے لیے۔“ ہنسنے ہنسنے ویرا بے حال ہو گئی۔ امرحہ بھی ہنسنے لگی۔

”یہاں بڑی مانگ ہے پنا ٹیرم کی۔ تم تو مزے سے

ہزاروں پونڈ کمالیتیں۔ آج کل تو پروفیسرز کو پنا ٹیرم کرنے کے لیے کہا جاتا۔ بابا۔ منہ مانگے پونڈ ملے تمہیں امتحانات کے دنوں میں۔“

لیکن یقیناً کارل کو اپنی تیاری سے زیادہ امرحہ کی فکر تھی کہ وہ بے چاری یہ نہ سوچتی ہو کہ اسے کوئی تنگ نہیں کر رہا۔ آخر اس کے ساتھ یہ غیروں والا سلوک کیوں؟ تو وہ اس کے ساتھ اپنی جیسا سلوک کرنے لگی رات علی لرنگ میں موجود تھا۔

علی لرنگ میں امتحانات کے دوران پڑھنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ جو پورا سمسٹر آپ کو نظر نہیں آتے وہ نظر آتے آتے آپ کے دوست بن جاتے ہیں۔ پورا مہینہ علی لرنگ کاسن میں ”ہاؤس فل شو“ ہوتے۔ جو راتوں کو اپنے بستر پر سوتے ہیں وہ یہاں اونگھتے اور پڑھتے پائے جاسکتے ہیں۔ رات رات بھران کی شکلیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ علی کاسن، لائبریری، کیفے جو بیس گھنٹے کھلے رہتے تھے۔ تو کارل اس کے سامنے آکر بیٹھ گیا۔ امرحہ نے اس کے اٹھنے کا انتظار کیا اور مکمل توجہ سے پڑھنے کی کوشش کی، لیکن بے کار۔ کبھی نوٹس اس کے ہاتھ سے گر جاتے، کبھی پن اور پھر لپ ٹاپ بھی گر گیا۔

اف اب وہ اتنا سامان سمیٹ کر دوسری جگہ جائے۔ اب تو اسے فلور پر ہی بیٹھنا پڑے گا کیونکہ سب جگہیں پُر تھیں۔ اور اسے یقین تھا، وہ جہاں بھی جائے گی۔ کارل اس کے سامنے آکر ایسے ہی بیٹھ جائے گا۔

کارل خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کے دماغ میں کچھ چل رہا ہے اور جو چل رہا ہے وہ ایسا کچھ اچھا ہرگز نہیں ہے۔ کارل کے دماغ میں ایک ایسی ہیٹھری فکس تھی جو کبھی ڈاؤن نہیں ہوتی تھی۔ سب امتحانات کے مارے ہوئے تھے اور وہ الٹی سیدھی حرکتوں میں غلطیاں تھا۔ پھر بھی ہر سال وہ اسکا لرشپ لے لیتا تھا۔ اگر وہ ایسی حرکتیں نہ کرے اور صرف پڑھے تو یقیناً ”وہ یونی کاؤن بن جائے۔ سارے کتابیں، نوٹس، کانڈیلپ

ٹاپ، پن وغیرہ کو اپنی بانہوں میں عارضی طور پر سمیٹ کر وہ بمشکل اٹھی اور نئی جگہ کی تلاش کرنے لگی۔

وہ چند قدم ہی چلی ہوئی کہ اس کے ہاتھ پر بجلی گری۔ جی بجلی۔ آسمانی نہیں۔ زمینی۔ کارل نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پن کو اس کے ہاتھ پر لگایا تھا ایک دم سے پیچھے سے آکر۔ اور اس کے ہاتھوں میں پکڑی سب چیزیں زمین بوس ہو چکی تھیں۔ لپ ٹاپ بھی ”ٹھٹھا“ کر کے گرا تھا۔ اب اللہ ہی جانتا تھا وہ چلے گیا ستے داموں کے گا بھی نہیں۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ؟“ امرحہ چلائی۔

”کیا ہوا؟“ اف کارل کی معصومیت۔

”تم نے کیا لگایا ہے میرے ہاتھ پر؟“

”میرے ہاتھ تو خالی ہیں۔ صرف یہ ایک پن ہے میری ہاتھ میں۔ میں پڑھ پڑھ کر تھک چکا تھا، سوچا تم سے باتیں کر لوں۔“

”اس پن میں کچھ تھا۔ ضرور کچھ تھا۔“ امرحہ قسم کھا سکتی تھی اس میں کرنٹ تھا۔

”تمہیں میرے اس پن پر شک ہے؟“ اس نے پن لہرایا۔ ”دیکھو یہ صرف ایک پن ہے۔ اس سے لکھا جاتا ہے۔ لکھنا سمجھتی ہونا۔ ایسے۔ ایسے لکھتے ہیں۔“

امرحہ نیچے بیٹھ کر اپنی چیزیں سمیٹنے لگی وہ بھی نیچے بیٹھ کر اس کی چیزیں سمیٹنے لگا اور ایک بار پھر امرحہ کے ہاتھ پر کرنٹ کا ایک جھٹکا لگا۔ امرحہ نے چیخ ماری ”کارل نے دونوں ہاتھ اٹھا لیے۔“ ٹھٹھک ہے ٹھٹھک ہے۔ نہیں کرتا تمہاری مدد میں۔ تم تو جھگڑوں کی طرح چلا رہی ہو۔ میں یونیورسٹی انتظامیہ سے بات کرتا ہوں آخر وہ یونیورسٹی میں خلائی مخلوق کو داخلے کیوں دیتے ہیں۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے نا۔ اس طرح تو تم لوگ ہمیں پاگل کر دو گے، آخر ہم کیوں پاگل ہوں تمہارے لیے۔“

امرحہ نے لپ ٹاپ اٹھا لیا۔ ”اگر تم یہاں سے نہیں گئے تو میں تمہارا سر پھوڑ دوں گی۔“

”اس طرح تمہارا لپ ٹاپ بھی ٹوٹ جائے گا۔“

جہاں تک میرا خیال ہے ابھی تک میرے سر سے زیادہ تمہیں لپ ٹاپ عزیز ہو گا۔“

”تم اس کی جان کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟“ عالیان نے آکر ایک زوردار گھونسا اس کی کمر میں جڑا۔ اور اس کے ہاتھ سے پن جھپٹ لیا۔

کارل نے قہقہہ لگایا۔ ”میں تو یہاں سے گزر رہا تھا امرحہ نے ہی مجھے روکا کہ آؤ باتیں کرتے ہیں۔ باتیں شاتیں۔“

عالیان نے امرحہ کی سب چیزیں سمیٹیں اور اس کے ہاتھ میں کارل کا پن دیا۔

”اس پن کا استعمال میں تمہیں سکھا دوں گا۔ اگلی بار یہ تمہارے پاس آئے تو اسی پن سے اسے کرنٹ دینا۔“

امرحہ نے تبرک کی طرح پن کو قبول کیا۔ اور اپنی کلاس فیلو کی ٹیبل پر چلی گئی۔

کارل کا قہقہہ اس کے پیچھے گونجتا رہا۔ کارل انسانی طے میں ایک غیر انسانی مخلوق۔ بلاشبہ۔

پن میں ایک ہیوی بیٹری فکس تھی جو پن کے کپ کو بائیں طرف حرکت دینے پر کام کرتی اور پن کی کب سے ہلکا سا کرنٹ نکلتا۔ جو معمول کے اوقات میں کافی زوردار لگتا۔ عام استعمال میں وہ پن ایک عام لکھنے والا پن تھا۔ صرف اس کا مالک ہی اس کا استعمال جانتا تھا۔ اور اس کا مالک کارل تھا۔ یہ پن کبھی کارل کا ٹریڈ مارک تھا۔ اب تو کارل کے لیے پرانا ہو چکا تھا۔ لیکن امرحہ کے لیے بہر حال نیا ہی تھا۔ امرحہ کے لیے ہی اس نے نکالا تھا۔

وہ اس پن کا استعمال، یونی میں، اسٹوڈنٹس سے بھرے کوریڈورز، لان، کلاسز، گراؤنڈ، لائبریری، سب ویز، بس، ہوٹل، بارز، کلب، کیفے ہر جگہ کیا کرتا، خریداری کے دوران بھی، سڑک پر چلتے رش والی جگہ پر بھی۔

کئی بار کلاس میں اس نے پروفیسرز کو بھی یہ جھٹکے دیے تھے۔ جس دن اس کا یہ موڈ ہوا وہ پہلی رو میں



بٹھ جاتا اور بلاوجہ لیکچر کے دوران یہ ظاہر کرنا کہ اسے لیکچر میں فلاں فلاں پوائنٹ سمجھ میں نہیں آ رہے۔

پروفیسر چلتے اس کے قریب آ جاتے۔  
کارل دونوں ہاتھوں کو کھڑا ہو کر لہراتا اور ایسے لہراتا جیسے اسے بات کے دوران ہاتھ چلانے کی عادت ہے۔ بہت سے لوگوں کو یہ عادت ہوتی ہے۔ خیر ہاتھ چلاتے چلاتے پین پروفیسر کی ٹھوڑی گردن کان کی لو اور کبھی ناک سے ٹکرا جاتا۔ ایسا ہو ہی جاتا ہے اس میں کوئی جبرانی کی بات نہیں۔ خیر۔۔۔ تو اور بے چارے پروفیسر۔۔۔ بھری کلاس میں چلا اٹھتے۔ ڈر کر۔۔۔ حواس باختہ سے ہو جاتے ایک دم سے اچھل پڑتے۔ بے چارے پروفیسر صاحب۔۔۔  
ایسے موقعوں پر کلاس کے لیے اپنے قہقہوں کا گلا دہانا مشکل ہو جاتا۔ عالیان کہیں قریب ہی ہوتا تو اس کی کمر پر چٹکی بھرتا۔  
”کسی کی جان جائے گی تیرے اس چھوٹے موٹے کرنٹ کے گولے سے۔“

”گئی تو نہیں نا۔۔۔ ویسے بھی سائنس کہتی ہے کہ ایک عام انسان کے جسم میں اچھے خاصے ویلٹیج کے کرنٹ کو سنبھالنے کی طاقت ہوتی ہے۔“  
”سائنس کہتی ہے یا کارل کہتا ہے۔“  
”کارل کسی سائنس سے کم ہے کیا۔۔۔؟“ آنکھ مار کر۔

تو یہ ہے کارل۔ انسانی حلیے میں غیر انسانی مخلوق۔  
ویلکم ویک پر اس نے فریشرز کا کافی بھرتہ بنایا تھا۔ وہ تو سارا سال ویلکم ویک کا انتظار کرتا تھا فریشرز میں تو اس کی جان ہوا کرتی تھی۔ وہ اپنے سارے پرانے اوزار نکال لیا کرتا تھا۔

اکثر سینئر فریشرز کو گائیڈ کرتے ہوئے کانڈ پر یہ بھی لکھ دیتے ”اور کارل سے بچ کر۔“

Have a safe welcome week  
کارل ویلکم ویک کے پانچ دن نئے انداز اپناتا۔  
ماہ پہلے دن ملنے والے اسے دوسرے دن پہچان نہ

سکیں، دوسرے دن ملنے والے اس کے ہاتھوں تیسرے دن بھی الون سکیں۔ وہ واڑھی اور بال بڑھالیتا۔  
”دوسرے دن کوا لیتا“ تیسرے دن ہرے رنگ کی بوگ چوتھے دن گنجا۔۔۔ ساتھ کان ناک، ٹھوڑی اور بھنوں میں بالیاں۔۔۔ پانچویں دن لمبے بال۔ کارل  
”Ask me“

جس نے اسٹوڈنٹ کارڈ بنوانے جانا ہے اسے وہ بڑے آرام سے یونی سے باہر کسی بھی دوسری عمارت میں بھیج دیتا۔

کئی بے چارے معصوم ایشیائی جو ڈرے ڈرے سے تھے اور اپنی ماما اور پیپا کے ساتھ یونیورسٹی کے گیٹ تک آئے تھے ان کو اس نے ہاتھ روم میں لاک کر دیا۔  
جی اس کے پاس اوزار تھے وہ دروازے کے ہینڈل میں ایک باریک سلاخ اڑا کر اسے جام کر دیتا تھا۔ ہو گیا لاک۔۔۔ اب یہ اندروالے کی طاقت پر ہے کہ وہ کس زور سے ہینڈل کے ساتھ زور آزمائی کرتا ہے اور کتنی جلدی باہر آتا ہے۔

اور ایسے کام وہ بہت احتیاط سے کرتا۔ اسے بھی یونی میں رہنا تھا۔

چند لڑکیوں کو اس نے سائنس لیب میں بند کر دیا تھا۔  
”امرحہ کی قسمت اچھی تھی کہ ویلکم ویک پر اس کا ٹکراؤ کارل سے نہیں ہوا تھا۔۔۔ ورنہ تو اس کی سائنس لیب میں ہی موت واقع ہو جاتی۔“

اور فریشرز ویک پر ایک فریشر امرحہ لیب سے مرہ نکلتی۔  
اور مائچسٹر میں اپنی آمد کے چوتھے دن تابوت میں بند ہو کر پاکستان واپس جاتی۔ اور دادا یہ معلوم نہ کر سکتے کہ پاکستان میں تو سب اس بے چاری کی پیچھے بڑے رہتے تھے مائچسٹر میں کون اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔

ہر فریشر رو کر سکیپ پر اپنے گھر والوں کو ہری وگ منجے سر، لمبے بالوں والے Ask me کا قصہ سنا رہا ہوتا۔

فریشر کے آتے ہی یونی میں کارل۔۔۔ کارل ہو رہی ہوتی۔

اسٹوڈنٹ یونین کے صدر اور باقی لوگ اسے خبیثگی سے محتاط رہنے کے لیے کہتے تو وہ بڑی معصومیت سے کہتا۔  
”پتا نہیں آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا میں نے کسی کی جان لے لی ہے۔ یا میں ٹکڑیوں۔“  
یعنی وہ جان لے گا تو ہی کوئی چھوٹا موٹا جرم مانا جائے گا۔



چینی کہتے ہیں۔  
”اگر میں ایک سرسبز شاخ سے اپنے دل کو سجاؤں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک خوش گلو پرندہ اس پر آکر نہ بیٹھے۔“

اور ان کا کہنا ہے کہ  
”محبت کرنے سے پہلے احترام کرنا سیکھیں۔“ اور یہ بھی کہ۔

”ایک بوڑھے کا عشق میں مبتلا ہو جانا خزاں میں پھول کھلنے کے مترادف ہے۔“

اور خزاں میں محبت کا پھول ہی کھلنے کی جرات کرتا ہے۔ بدھانے سب جانوروں سے کہا کہ نئے سال پر مجھ سے آکر ملو۔ صرف بارہ جانور بدھانے ملتے آئے اور بدھانے ان بارہ کے نام ایک ایک سال کر دیا تیل، مرغ، خرگوش، بکری، چیتا، خنزیر، سانپ، ڈریگن، چوہا، گھوڑا، بندر اور کتے کے چینی سالانہ کیلنڈر ان جانوروں کے ناموں سے ترتیب پاتے ہیں اور چینی اپنے سال کے آغاز سے پہلے پورے جوش و خروش سے اپنے گھروں کو صاف کر کے سجاتے ہیں، نئے کپڑے خاص طور پر سرخ لباس بنواتے ہیں۔ سرخ کانڈوں اور سرخ پارچہ جات پر لکھی روایتی نقلموں سے گھر کے دروازوں، دیواروں اور ایسی ہی دوسری جگہوں کو سجاتے ہیں۔

نئے سال کا آغاز ہو رہا ہے۔ پرانا وقت بیت چکا ہے۔

پرانے وقت کو الوداع کہا جائے گا۔ نئے وقت

کے لیے جشن تیار ہے۔ بڑے بوڑھے بچوں کو سرخ لفافوں میں ملفوف ”گلی مٹی“ (خوش قسمتی کے سکے) دیتے ہیں۔ چینی روایات کہتی ہیں کہ سرخ رنگ آگ کی علامت ہے، جو ان کے سیانوں کے بقول بد قسمتی اور بدی کو دور کرتی ہے۔ قدیم دقتوں میں لمبے بانسوں کو جلایا جاتا تھا تاکہ بدی اور بلائیں آگ کو دیکھ کر بھاگ جائیں، شر کو آگ سے دفنانا کیا جاتا تھا۔

بدی اور بلائیں۔ دنیا کی ہر قوم انہیں دفنان کرنے کا چارہ کرتی ہے، غیر اور اچھی قسمت۔ دنیا کی ہر قوم اس کے حصول کے لیے تک و دو کرتی ہے۔ چینی نیا سال۔ خاندان کے ملاپ کا تہوار۔

پہلے چاند کی پندرہ کو سرخ چینی ساختہ لالٹینوں کا تہوار منایا جاتا ہے۔ لالٹینیں جن پر ”پھول“ پودے، برندے، برنجی جانور، تاریخ اور روایتی قدیم تاریخی شخصیات کندہ ہوتی ہیں سے عبادت گاہوں کو سجایا جاتا ہے اور ہاتھوں میں لے کر شام کو چاند کی روشنی میں پریڈ مارچ کیا جاتا ہے، چینی سال۔۔۔ بہار کا آغاز۔۔۔ دعاؤں کے ساتھ۔۔۔ خوشیوں کو لیے۔ بدی کو دور کرتے۔ روایات کو زندہ رکھتے۔

سرخ سرخ۔ روشن روشن۔ منظم اور پر جوش۔ سال کے آغاز پر اپنی میزوں کو Dumpling (روایتی چینی کھانا) سے سجاتے ہوئے۔ دعائیں دیتے ہوئے۔ چادلوں کے جاروں کو بھرتے ہوئے کہ نئے سال پر چینی چادلوں کے جار کا خالی رہ جانا بد قسمتی کی علامت سمجھتے ہیں۔

چینی کبھی دوسری اقوام کی مذہبی، روایتی، علاقائی تقریبات کو تحارت سے نہیں دیکھتے۔ اور اپنے لیے وہ دوسری اقوام سے بھی یہی توقع کرتے ہیں۔

انہیں ابتدائی اسباق میں ہر خاص و عام کے احترام کا سبق پہلے دیا جاتا ہے، اسی لیے یہ ہر ایک کے سامنے تعظیم سے جھکتے نظر آتے ہیں، اور انہوں نے دنیا پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ احترام کرنا جانتے ہیں۔

مائچسٹر میں اس سال کی ڈریگن پریڈ (نئے سال کی پریڈ) کے لیے تیاریاں عروج پر تھیں۔ پریڈ اکتیس



جنوری نئے سال کے پہلے دن تھی یہ سال گھوڑے کا سال تھا پچھلا سال سانپ کا سال تھا۔ امرجہ کی چینی کلاس فیلوٹی سن (Jee sun) نے سب کلاس فیلوز کو رجسٹریشن کروانے کے لیے کہا تھا۔ وہ امرجہ کے پاس بھی آئی تھی۔

”میں تو جانتی بھی نہیں کہ یہ سب کیا ہوتا ہے میرے لیے تو کھڑے ہو کر دیکھ لینا ہی بہت بڑی دریافت ہوگی کہاں اس میں شرکت کرنا۔“

”پریڈ میں جاؤ گی تو سب جان جاؤ گی۔ تمہیں زندگی میں کھڑے ہو کر پریڈ دیکھنے کے تو کئی بار مواقع مل جائیں گے شرکت کرنے کے نہیں۔ اس سال تو نوے ہزار سے زیادہ لوگ شرکت کریں گے۔“ وہ ہنسنے لگی ”نہیں! میں نے یہ سب کبھی نہیں کیا۔“

”جو کیا نہیں وہ کرو گی بھی نہیں۔ چینی پاکستانی کو ”ناں“ نہیں کہتے ایک پاکستانی چینی کو ”ناں“ کیسے کہہ سکتا ہے۔ غیر چینی لوگ پریڈ میں شرکت کرتے ہیں تو ہمیں اچھا لگتا ہے ہمیں یقین ہوتا ہے کہ نئے سال کا آغاز ہم نے سب اقوام کی دعاؤں اور محبت سے کیا ہے۔ ہم دونوں تو ایشیائی خطے کے دو اہم دوست بھی ہیں اور ہمسائے بھی۔ قطار میں تین غیر ملکی کھڑے ہوں تو ہم پہلے پاکستانی کے آگے Bow کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔“

امرجہ متاثر ہو گئی۔ جی سن ٹھیک کہہ رہی تھی امرجہ کبھی بھی کسی بھی طرح کی مدد کے لیے جی سن کے پاس جاتی وہ فوراً اس کی مدد کے لیے تیار ہو جاتی تھی۔ ابتدائی تعارف میں اس نے امرجہ کو گلے سے لگایا تھا اور دوبار اس کے آگے جھکی تھی۔ اس نے اسے بتایا کہ اس کے دادا تجارتی غرض سے ایک بار پاکستان گئے تھے اور پہاڑی علاقے میں خوفناک حادثے کا شکار ہو گئے تھے سردیوں کے دن تھے اتفاق سے دو پٹھان پہاڑی بچوں نے انہیں دیکھ لیا اور ایک بچہ کئی گھنٹے ان کے ساتھ برف میں ان کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو سہارا دینے اور انہیں بے ہوش ہونے سے

بچانے کی سعی کرتا رہا تاکہ وہ کومہ میں نہ چلے جائیں۔ کئی گھنٹے بعد دو سراجپہ مدد لاسکا اور پہاڑی لوگوں سے مل کر چھ مہینے تک ان کی تہہ رت داری کی۔ میرے دادا ہر سال نئے سال کی دعاؤں میں ان سب پہاڑی پٹھانوں کو یاد رکھتے ہیں اور ان کے لیے خوشحالی اور خوش قسمتی کی دعائیں کرتے ہیں۔ وہ امرجہ کو پٹھان سمجھتی تھی اس کے نزدیک سب پاکستانی پٹھان ہی تھے۔ امرجہ کو خوشی تھی کہ پہاڑی پٹھانوں نے اسے ماچسٹر اور اتنی بڑی یونی میں معتبر کر دیا ہے۔

کسی بھی قوم کے ایک فرد کی گئی نیکی بلاشبہ ساری قوم کا سرخسر سے بلند کروا دیتی ہے۔ ”مجھے ہنسی آئے گی۔“ امرجہ کو ابھی بھی تامل تھا۔ ”تو ہنستی رہتا“ بلکہ چھلانگیں لگاتا۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ روتے بسورتے لوگوں کا وہاں کیا کام۔ ویسے تم کس جانور کا لباس پہننا پسند کرو گی؟

میں انتظام کروں گی۔ چاہو تو کوئی ماسک نہ پہنتا۔ تم ڈریگن کا لباس بھی پکڑ سکتی ہو لیکن اس کے لیے تمہیں مسلسل حرکت میں رہنا ہوگا، تم تھک جاؤ گی، میں روایتی چینی لباس کمونو پہنوں گی اور میرے ہاتھ میں بڑا سا چینی پنکھا ہو گا میرا میک اپ بہت گہرا ہو گا۔ چاہو تو تم میرے ساتھ یہ بن سکتی ہو۔ یا تم Percussion (دو بڑی گول دھانی ہلیٹوں پر مشتمل ساز، دونوں ہلیٹوں کو آپس میں ٹکرایا جاتا ہے) بجا سکتی ہو۔ یا ڈرم۔ لیکن تمہیں ڈرم بجانے کی پریکٹس نہیں ہو گی۔

”نہیں میں کمونو نہیں پہن سکتی۔ گہرا میک اپ تو ہرگز نہیں۔“

”اگر تم شرمارہی ہو تو میرا مشورہ یہ ہے کہ تم ڈریگن کا لباس پہن لو۔ اسے پہن کر قطعاً یہ معلوم نہیں ہو گا کہ تم کون ہو لڑکی یا لڑکا۔ تمہاری مخصوص مشرقی جھجک بھی قائم رہے گی۔ بھلے سے ماسک کے اندر شرماتی گھبراتی رہنا۔ ہستی۔ قہقہے لگاتی رہنا۔“ امرجہ دل کھول کر ہنسی ”ٹھیک ہے۔ میں ڈریگن بن جاتی ہوں۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں یہ تمہاری زندگی کا یادگار لمحہ ہو گا۔ تم پر قسمت مہربان ہو گی۔“ امرجہ اور زیادہ مسکرانے لگی۔ ”انتظار رہے گا پھر اس لمحے کا۔“

\*\*\*

چینی نئے سال کی رات میں سب مل کر چائنا ٹاؤن گئے۔ چائنا ٹاؤن کسی بھی ملک یا شہر میں آباد چینوں کے علاقے کو کہا جاتا ہے جہاں سب چینی ایک مخصوص علاقے میں بڑی تعداد میں رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ چائنا ٹاؤن کی حدود کے آغاز پر سرخ نیلے ’سبز‘ روایتی چینی رنگوں سے سجی بنی چینی طرز تعمیر کا بڑا بھانگ آتا ہے۔ جس کے دونوں اطراف جانوروں کے بڑے بڑے مجسمے رکھ دیے گئے تھے۔ سب سے بڑا مجسمہ گھوڑے کا تھا۔ ایک بہت بڑے ڈریگن کو بانوں کی مدد سے اونچائی پر ٹانگ دیا گیا تھا۔ جا بجا چینی اسٹالز لگے تھے جن پر چین کی روایتی چیزوں کی بھرمار تھی، ماچسٹر کے درختوں کی شاخیں تو پہلے سے ہی سرخ گول چینی ساختہ لالٹینوں سے سجادی گئی تھیں۔

این، ویرا اور وہ مزے سے مفت چینی کھانے کھاتے رہے۔ تمام اسٹالز پر یا کھانے بہت کم قیمت پر دستیاب تھے یا مفت باننے جا رہے تھے۔ امرجہ ایک چینی تحفہ بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ ایک عدد چینی شادی شدہ جوڑا اپنی شادی کی سلور جوبلی پر تحائف تقسیم کر رہا تھا اور ماچسٹر یونی کے اسٹوڈنٹس کا وہاں اتنا رش تھا کہ لگتا تھا سب اسٹوڈنٹس آئندہ زندگی اس ایک تحفے پر گزارنے والے ہیں۔

تحفے میں ایک عدد روایتی سرخ پارچہ تھا جس پر چینی زبان میں لکھی تھی۔ ایک ہاتھ میں پہننے کا چینی طرز کا کنگن تھا اور دو سرخ رن تھے۔ امرجہ کو دو عدد سرخ رنوں کی سمجھ نہیں آئی۔ جب ان میاں بیوی کے اسٹال پر رش ذرا کم ہو گیا اور ان کے سب تحائف تقسیم ہو گئے تو امرجہ ان سے پوچھنے لگی۔

”ایک تمہارے لیے اور ایک تمہارے شوہر کے

لیے‘ جب مجھے انہوں نے۔“ چینی خاتون نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کیا ”پرویز کیا تھا تو یہ اتنے غریب تھے کہ ان کے پاس کوئی انگوٹھی نہیں تھی تو انہوں نے ایک اسکول جاتی بچی کے بالوں میں سے رن کھول کر میری انگلی میں باندھ دیا کہ مجھے کوئی انگوٹھی والا نہ لے آئے۔“

دونوں میاں بیوی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔ امرجہ دیکھ سکتی تھی کہ دونوں نے کس محبت سے اپنی زندگی گزاری ہو گی۔

سرخ رن امرجہ کی آنکھوں میں بس گئے۔ آنکھوں کے پاس لا کر وہ انہیں دیکھنے لگی۔ اسے ایک دم سے ڈر لگنے لگا کہ یہ رن کہیں کھونہ جائیں۔ اس نے انہیں اپنے کراس بیگ کی محفوظ جیب میں رکھا۔

پھر ہاتھ کو کراس بیگ پر مضبوطی سے ٹکا لیا اسے لگنے لگا کہ سارے چوروں کی نظر اس کے ان دو عدد رن پر ہی لگی ہو گی۔

سرخ نظمیں پارچہ ویرا نے اپنے بال کھول کر سر پر باندھ لیا۔ اور کنگن این اون نے پہن لیا۔ امرجہ نے یہ دو چیزیں انہیں خوشی سے دے دی تھیں۔

”لاؤ وہ رن بھی میری کلانی پر باندھ دو۔ ایک تم باندھ لو۔“ امرجہ نے ویرا کو نہیں بتایا تھا کہ رن کے ساتھ کیا کہانی منسلک ہے۔ امرجہ کی جیسے جان ہی نکل گئی۔

”وہ میں پاکستان لے کر جانا چاہتی ہوں۔“ ”رن؟“ ویرا حیران ہوئی۔

امرجہ نے سر ہلایا۔ ”میں پہن کر تمہیں واپس کر دوں گی۔ اس پر جو ستارے لگے ہیں مجھے وہ اچھے لگے ہیں۔“

”میں نے ابھی رن نہیں باندھا۔ میں انہیں ان چھوڑ رکھنا چاہتی ہوں۔“ امرجہ نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

”بعض معاملات میں تم بہت عجیب ہو امرجہ!“ ”مجھے لگتا ہے میں پوری کی پوری ہی عجیب



176 204

محبت ابن عربی کا نظریہ الہیت ہے جو ناپیدہ کو دیدہ بنا  
کے

شعبان ۱۴۲۸

177 2014



جیسا کہ اس نے دیر کو دیکھا تو اسے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ وہ دیر ہے۔ یقیناً اس کے ڈریگن کو دیکھ کر بھی نہیں بوجھا جاسکتا تھا کہ اس کے اندر امرجہ ہے۔ سڑکوں سے ست روی سے گزرتے چائنا ٹاؤن کی طرف جاتے مختلف جگہوں پر ان پر چوکور رنگ برنگی جھنڈیاں برسائی گئیں۔ جنہیں مشین کے ذریعے فضا میں چھوڑا جاتا اور فضا کی میٹر بندی تک ایسے رنگ برنگی ہو جاتی جیسے تیلیوں کے قافلے ان پر ٹوٹ پڑے ہوں۔

امرجہ نے اب کھل کر مسکراتا شروع کر دیا تھا وہ ڈریگن بنی ہاتھ ہلا ہلا کر بچوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اسے مڑا آ رہا تھا۔ اسے سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ جہاں جہاں ان پر رنگ برنگی جھنڈیاں برسائی گئی تھیں وہاں وہاں امرجہ کو لگا تھا یہ سب اس کے لیے کیا جا رہا ہے۔

لاہور میں چھپ چھپ کر رونے والی لڑکی کے لیے ایک منحوس مان لیے گئے انسان کے لیے۔ امرجہ افسوس کر رہی تھی کہ وہ کیوں روتی رہی تھی۔ زندگی میں آپ نے لوگوں، نئی خوشیوں، نئے جہنموں سے روشناس ہوتے ہیں تو ماضی کے دکھ بے معنی اور چھوٹے لگنے لگتے ہیں۔ اپنی بے وقوفی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے کہ کیا ناولی کرتے رہے ہیں۔ زندگی میں دکھ اور سکھ دونوں ہوتے ہیں۔ بس انہیں کشید کرنا پڑتا ہے۔

پاکستان سے جو لوگ، تعلیم، روزگار کے سلسلے میں یورپ آتے ہیں وہ یہ ضرور سوچتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگیوں کو ایسا پر رونق اور فعال کیوں نہ بنایا۔ شاہی ہو کر جانے والی خواتین یہ ضرور سوچتی ہیں کہ اف کیانی وی دیکھ دیکھ، خریداری کر کر کے اپنی زندگی برباد کرتے رہے پاکستان میں۔

تو دنیا ماحول آپ کو نئے اسباق ضرور پڑھاتا ہے۔ کچھ اچھے کچھ بُرے۔ کچھ آپ کی مرضی سے۔ کچھ زبردستی۔

اسباق سے گھبراننا نہیں چاہیے۔ یہ کتنے بھی تلخ ہوں حکیم لقمان کی حکمت لیے ہوتے ہیں۔ بلا معاوضہ حکمت دے کر جاتے ہیں۔

تو اب رنگ تھے۔ جشن تھا۔ لوگ تھے۔ اور قہقہے تھے، موسم نم نم تھا۔ جنوری کا آخری دن تھا اور چینیوں کے لیے سال کا پہلا دن۔ اس بات کی علامت کہ جہاں کچھ ختم ہو رہا ہوتا ہے ٹھیک وہیں سے کچھ اور شروع ہو رہا ہوتا ہے۔

نظام قدرت اس جنم مرگ۔ مرگ جنم کا نام ہے۔

شام گہری ہو چکی تھی۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے سے چل رہے تھے، لیکن جھکن نے آج ان سے دوستی کر لی تھی وہ پھولوں سے لدی دور سے ہی ہاتھ ہلا رہی تھی۔ وہ چائنا ٹاؤن کے قریب پہنچ رہے تھے۔ دور سے پریڈ کے استقبال کے لیے بجائے جانے والے ڈرموں اور

دوسرے سازوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

”امرجہ!“ ڈرموں کی پُر زور تھاپ اور دھاتی پلیٹوں کی گونج میں یہ نام اس کے قریب بیٹھے سُر سنگیت لیے گونجا۔

اس کے قریب ہی ایک اور ڈریگن کھڑا تھا۔ وہ قد میں اس سے اونچا تھا۔ ڈریگن نے ماسک اتارا۔ اور مسکرایا۔ وہ عالیان تھا۔

ایک لڑکی ہے امرجہ۔ شہر روشن۔ شہر قلم کار۔ شہر بے مثال لاہور سے۔ ایک لڑکا ہے عالیان۔ شہر جمال۔ شہر افکار۔ شہر لا زوال ماچسٹر سے۔

نئے سال کے پہلے دن۔ ہمارے پہلے دن۔ شہر بے مثال۔ شہر لا زوال کے پاس ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔ اور ایک محبت ہے

جہاں بے مثال۔ جہاں لا زوال۔

جہاں جاوداں۔ جاوداں سے۔

امرجہ کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ بھی پریڈ میں شامل ہے۔ اتنے ہزاروں لوگوں میں وہ چاہتی بھی تو معلوم نہیں کر سکتی تھی۔ اسے صرف اپنے کلاس فیلوز کا ہی معلوم تھا۔ عالیان کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ جیسے وہ آخری وقت میں کسی طرح سے ڈریگن کا لباس حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا اور افراتفری میں پریڈ میں شامل ہوا اور اسے تلاش کرتا رہا ہے۔

”دادو مجھے۔ میں نے تمہیں اتنے سارے جانوروں اور ماسکوں میں سے پہچان لیا۔“

”دادو دیتی ہوں تمہیں۔“ اتنے سارے ہزاروں لوگوں میں سے جو اپنی شکل اور وضع قطع چھپائے ہوئے تھے کسی ایک کو ڈھونڈ نکالنا قابلِ داد تھا۔ وہ ڈھائی سو کے قریب تو صرف امرجہ جیسے ڈریگن ہی تھے۔

”کتنی زبردست پریڈ ہے نا یہ امرجہ۔“ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ڈریگن کا سر اتار کر اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا تاکہ اس کی آواز آسانی سے سنی جاسکے۔ امرجہ کو وہ معمول سے زیادہ خوش لگا۔

”امرجہ! مجھے ایسے جشن، ایسے تہوار، جب سب خوش ہوں، گارے ہوں، مسکرا رہے ہوں، بہت اچھے لگتے ہیں۔“ اس نے سڑک کے کنارے کھڑے پریڈ کو دلچسپی، شوق، جوش و خوشی سے دیکھتے ایک چھوٹے بچے کے گال پر نرمی سے چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے اسی بچے کے ساتھ کھڑے دوسرے بچے کے بالوں میں محبت اور لگاؤ سے ہاتھ پھیرا۔

اس کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ غیر معمولی پُر جوش اور خوش ہے۔

”تمہیں بھی پسند ہے یہ سب؟“ اس نے اس کے سر کے پاس سر جھکا کر کہا۔

”ہاں! مسکرائیں گے اچھی نہیں لگتیں؟“ امرجہ کو چلا کر بتاتا پڑا۔ عالیان نے کان کو اس کے ماسک

کے قریب جھکا دیا۔ اس نے ایسا خوشی سے کیا۔ امرجہ شہزاد بنی اسے ہزاروں راتوں پر محیط الف لیلیٰ سنائی تو شاید وہ خوشی سے سر کو ایسے ہی جھکائے رکھتا۔ سر نہ اٹھاتا۔

”ہاں! لیکن کبھی کبھی تو ان سب کے ساتھ بھی مسکرائیں اچھی نہیں لگتیں۔“ اس نے آس پاس کے سارے ماحول کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”یہ تو کچھ ہو جانے سے سب اچھا اچھا لگتا ہے۔“ ایک بچہ جو اپنے باپ کے کندھوں پر سوار تھا اور تالیاں بجا رہا تھا کہ اس کے گال پر نرمی سے چٹکی بھر کر کہا۔ بچہ کھلکھلا اٹھا اور اپنے باپ کے بالوں کو شرارت سے ٹھیکوں میں جکڑ لیا۔

امرجہ نے ماسک اتار دیا۔ اس سے ٹھیک سے عالیان کی آواز نہیں سنی جا رہی تھی۔

”کیا ہونے سے اچھا لگتا ہے؟“ امرجہ اس کی بات ٹھیک سے سن نہیں سکی تھی۔ جھوم کے شور کی وجہ سے اسے چلا کر پوچھنا پڑا۔

عالیان نے ذرا رگ کر اس کی طرف دیکھا۔ رک گیا۔ روک دیا گیا۔ شاید وہ فیصلہ کر رہا تھا۔

”محبت کے ہو جانے سے۔“ اس نے بلاوجہ ہی چلا کر کہا جبکہ امرجہ اپنا ماسک اتار چکی تھی چلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یقیناً وہ ڈریگن پریڈ میں شامل

ایک ایک انسان کو بھی سنا سنا چاہ رہا تھا۔ سڑک کے اطراف میں کھڑے، مردوں، عورتوں، بڑے، بوڑھوں اور بچوں کو بھی۔ سارے ماچسٹر کو۔ ساری دنیا کو اس کے ہونٹوں سے نکلے الفاظ کی گونج یقیناً چائنا ٹاؤن کی محراب کے پاس تیس چالیس بڑے بڑے ڈرموں کو اپنے سامنے رکھے سرخ لباسوں میں لمبوس پہلی پٹیاں سر پر باندھے چینیوں تک بھی گئی ہوگی۔ انہوں نے لفظ ”محبت“ کی گونج کو پا کر۔ اسے اپنے اندر اتار کر پھر پُر جوش سے۔ عقیدہ، احترام سے۔ دونوں ہاتھوں میں پکڑی ڈرم اسٹکس کو سر سے اوپر اٹھا کر سرخ ڈرموں کی پہلی زمین پر دے مارا۔

محبت کے سازی کی پہلی گونج گونجی۔



مشرق نے مغرب میں آکر میلہ سجا دیا۔  
استقبال کا آغاز ہوا۔ خوش آمدید۔ ہمارے گھر  
لگانے کے لیے ہم بے تاب ہیں۔ ہمارے آمد آمد ہے  
خزاں کو رخصت ہو جانا چاہیے۔  
اولفظ محبت سے ابتدا کریں۔ آؤ اس کی انتہا  
کریں۔ رجوم (شہاب ثاقب) کا ایک طویل قافلہ  
رقص کنال گہری ہو چکی شام میں رک ابر (بادل کی سیاہ  
دھاری) سے ہوتا ہوا عالیان اور امرجہ کے سامنے سے  
گزر رہا۔

وہ ایک (مہربان) ابا بیل تھی وہ جہاں کی تہاں  
کھڑی تھی۔  
"میرا دل چاہتا ہے میری شادی ایسے ہی ہو۔" اس  
کی بھوری آنکھوں میں کئی خوش کن چمک دار رنگوں  
کی دھاریاں تلاطم مچانے لگیں۔  
"جانوروں کی طرح۔" امرجہ نے دوبارہ غلطی  
نہیں کی عالیان کی طرف دیکھنے کی نہیں۔ "وہ ہنسنا۔"  
"ایسے پریڈ کی صورت۔ اتنے ہی لوگوں اور ایسے  
ہی سازوں کے ساتھ۔"

وہ برطانیہ کا شہری تھا نا۔ تو یہ خواہش کیوں نہ رکھتا  
کہ اس کی شادی بھی شاہی شادی جیسی ہو۔ پریڈ کی  
صورت بارات جائے۔ بھی میں بٹھائے اور اپنی  
دلہن کو واپس لائے۔ اور آس پاس کھڑا ہجوم ان پر  
مسکراہٹوں اور دعاؤں کے ساتھ پھولوں کی بارش کر  
دے۔

وہ اور اس کی دلہن ہاتھ ہلا کر سب کی مسکراہٹوں  
کا جواب دیتے ہوں۔ دنیا بھر میں شاہی خاندان کی  
شاہیاں دیکھنے والے زندگی میں کم سے کم ایک پارہ  
خواب ضرور دیکھتے ہیں کہ ان کی شادی بھی پرنس  
چارلس پرنس ولیم کی طرح ہو۔ وہ تو پھر برطانیہ کا  
شہری تھا۔ اس نے یہ خواب کم سے کم سو بار تو ضرور ہی  
دیکھا ہو گا۔

"اچھا خواب۔ دیکھ لیتا چاہیے۔"  
"اگلے سال چینی نئے سال پر تم اپنی یہ حسرت پوری  
کر لیتا۔"

وہ آئے گی، ضرور آئے گی، اس کا رباب دعا گو ہے۔

اس کالیت سرسبز جو ہے  
پتیا نہ بدہ۔ پتیا نہ بدہ  
(جام دے۔ جام دے)  
پتیا نہ بدہ کہ خمار استم  
(ایسا جام دے کہ مجھے خمار آجائے)  
من عاشق چشم مست یار استم  
(میں یار کی مست آنکھوں کا عاشق ہوں)  
من عاشق چشم مست یار استم  
(میں یار کی مست آنکھوں کا عاشق ہوں)  
بدہ بدہ۔  
(دے۔ دے)  
بدہ بدہ۔  
(دے۔ دے)

وقت نے اپنے لبوں پر پریت بھری مسکراہٹ  
سجائی۔  
رقص کنال لہروں نے خسرو کمالی کے سروں کو چوما۔  
ہو آنے رک جانا ضروری جانا۔ خسرو کمالی کے  
لیے۔ اس کی زہرہ آفتدی کے لیے۔  
گل می کشم گل گلاب می کشم  
یارم۔ یارم۔  
خاک قدم پدی دم وارداستم  
یارم۔ یارم۔  
پروالوں نے کوک دی۔  
زریور جھیل نے پانی کی بوندوں کو تاروں کی مانند  
جگمگایا۔

رباب نے مناجات میں سوز و درد پیدا کیا۔  
اور خسرو کمالی نے آواز کو نرمی سے بلند۔ بلند اور  
بلند کیا۔  
"یارم۔ یارم۔ یارم۔" صدائیں ملک تک جا  
پہنچیں زہرہ آفتدی کا دیا گلابی رومال جھوم جھوم لہرایا۔  
"ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔ ہم اگلے سال اسی  
دن شادی کر لیں گے۔" ہاتھ میں پکڑا ڈریگن مارک  
امرجہ کے ہاتھ سے پھل کر گر گیا جسے اٹھانے کے

لیے وہ قطعاً نہیں جھکی۔ اسے اٹھانے کے لیے وہ  
پہلے سے ہی جھک چکا تھا۔  
"ہم۔" رنگ ریز نے سارے رنگ اس پر  
اچھال دیے، خاص کر نیلا لیکن پھر بھی وہ بے رنگ ہی  
کھڑی رہی۔ وہ سفید دھرتی نہیں تھی جسے من پسند  
رنگوں سے رنگ دیا جاتا۔  
"اس نے کہا ہم۔" کشمیر کی کلی افق نے دھاتی  
پلیٹیں بجاتے ہوئے فرزام کے قریب ہو کر سرگوشی کی۔  
"ہاں میں نے سنا۔ اس نے کہا ہم۔" فرزام نے  
ڈرم بجاتے ہوئے کہا۔  
"اور وہ اس کے آگے مارک اٹھانے کے بہانے  
جھک بھی گیا۔" افق شرارت سے مسکرائی۔  
رنگ برنگی جھنڈیوں کی بوچھاڑ فضا میں چھوڑی  
گئی۔  
خوش آمدیدی کا شور بلند ہوا۔  
دھاتی پلیٹیں ایک ساتھ کئی سو ہاتھوں میں  
گو نجیں۔  
ڈرموں پر سازندوں نے گول گول محوم کرانت مچا  
دی۔  
چینی رقصاؤں نے سرخ لباسوں میں خود کو فضا میں  
اچھالا اور چینی رقص کی ابتدا کی۔  
اس نے کہا "ہم" گلاب تو اب تباہ ہو گئی۔  
ہجوم نے پر جوش نعرے لگائے۔ ہمارے آمد کے  
جشن کو انہوں نے یاد گار بنا دیا تھا۔ فضا مشکبار ہو چکی  
تھی نسبت سے مشکبار پری یہاں بھی آچکی تھی۔  
فرزام اور افق کے بلاوے پر۔ امرجہ اور عالیان کے  
لیے۔ اس کے پیروں میں گرے مارک کو اٹھا کر وہ  
اسے واپس دے رہا تھا۔ پریڈ آگے جا رہی تھی۔ وہ  
دونوں ایک ہی جگہ کھڑے تھے۔

"تم نے سنا امرجہ! میں نے کیا کہا؟" اتنی پیاری  
بات پر اس کے لیے ایک مسکراہٹ تو بنتی تھی۔ وہ  
مسکراہٹ اسے نہیں دی گئی تھی۔  
"مجھ سے شادی کرو گی امرجہ؟ لیکن اس سے



فرق نہیں پڑتا۔ میں تو تم سے ہی شادی کروں گا۔ تم سوچنے کے لیے وقت لے سکتی ہو لیکن اس سے بھی فرق نہیں پڑے گا۔ میں سارا مانچسٹر اکٹھا کر ڈالوں گا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی کے باہر جب تم سارے مانچسٹر کو کھڑا دیکھو گی تو تمہیں ”ہاں“ کا بورڈ اٹھا کر سب کو دکھانا ہی پڑے گا۔“

وہ اپنی رو میں بول رہا تھا۔ وہ عالیان تھا ”ہاں“ کے بل بورڈ پر اس کا حق تھا کیونکہ وہ سارے مانچسٹر کو اکٹھا کر لانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

”میں۔ میری منگنی ہو چکی ہے۔ پاکستان میں میری واپسی کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ میری شادی ہونی۔“ انک انک کر وہ اتنا ہی کہہ سکی رجوم کے سب قاتلوں نے اپنی باگیں عالیان کے ہاتھوں سے چھڑا لیں۔

”خسرو کمالی کے رباب کی تان ٹوٹی۔ اس کی مناجات سہم گئیں۔“

”رتن دیب سے جی رتھ اڑان بھرتی منہ کے بل پاتال کی طرف لپکی۔“

”تالین بان کے حقیقی پارچے میں آگ بھڑکی۔“ سڑک کے کنارے پریدہ بھتی خاتون کے گود کے نیچے نے چلا کر رونا شروع کر دیا۔ چینیوں کا ماننا ہے کہ سال کے پہلے دن بچوں کا رونا ختم ہوتا ہے۔

چینی عورت سہم سی گئی اور اس نے شد و دے سے بچے کو چپ کروانا شروع کر دیا۔ لیکن بچہ اور۔ اور رونے لگا۔ وہ روتا ہی جا رہا تھا۔ یہ کیا۔ یہ کیسے۔ ابھی تو وہ قلعاریاں مار رہا تھا۔ اس نے تالی بھی بجائی ہوگی۔ بھانت بھانت کے جانوروں کو دیکھ کر وہ کیسے محفوظ ہوا ہو گا۔ چینی رقصاؤں کی طرح وہ بھی ناچنا چاہتا ہو گا۔ اس نے اپنی ماں سے ڈرم بجانے کی فرمائش بھی کی ہوگی۔

پھر۔ یہ سب کر کے بھی۔ اب وہ رونے لگا۔ وہ کیوں رونے لگا؟ اور ایک گیت تھا۔ خسرو کمالی کا۔

عالیان مار گریٹ کا۔ لفظ لفظ ترانہ۔ لفظ لفظ مرثیہ۔ اور ایک ساز برباب تھا۔

زر بو جھیل کنارے بجتا ہوا۔ ڈریگن پریڈ میں گونجتا ہوا۔

پھر جھیل کے پینڈے میں گونگا پڑا ہوا۔ ”امرہ!“ بھوری آنکھیں سیاہ پڑنے لگیں۔ اس نے امرہ کو ایسے دیکھا جیسے وہ اسے کوئی دھوکا دے رہی ہو اور وہ جانچ رہا ہو کہ اسے دھوکا کیوں دیا جا رہا ہے۔

”تم۔ یہ سب کیا؟“ اسے سمجھ نہیں آئی کہ سوال کو کن الفاظ سے ترتیب دے کہ من پسند جواب پا سکے۔ بھلا ایسا بھی ہوتا ہے کبھی؟

”ہمارے یہاں ایسے ہی ہوتا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ تم نے ایسا کیسے سوچ لیا۔ ہم تو دوست ہیں نا۔ لیکن پلیز تم دوبارہ ایسا کچھ نہ کہنا۔“ جلدی سے کہہ کر اس نے ماسک پہن لیا اور پریڈ کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔

اور پھر ساری پریڈ آگے بڑھنے لگی۔ ساری دنیا۔ ساری کائنات۔ صرف ایک وجود کھڑا تھا۔ ساکت تھا۔ پتھر کا ہو چکا تھا۔

وہ عالیان مار گریٹ کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ جو سارے مانچسٹر کو اکٹھا کر کے اس کی کھڑکی تک لے جانے والا تھا وہ سارے مانچسٹر میں اب خود کو ڈھونڈ ڈھونڈ اکٹھا کرتا پھرے گا۔

چینی ماں روتے بچے کو چپ کروانے میں ناکام ہو چکی تھی۔ اس کی شکل گہرے سایوں کی زد میں تھی۔ وہ اپنے عقیدوں پر پختہ یقین رکھنے والی لگتی تھی۔ اور اسی لیے پریڈ میں اس کی ساری دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔ اور وہ زیر لب دعا میں کر رہی تھی کہ نئے سال میں نحوست اور بلا میں اس سے دور رہیں۔ لیکن بچہ چپ ہی نہیں ہو رہا تھا۔

پریڈ چائنا ٹاؤن کی محراب کے اندر داخل ہو رہی تھی۔

ڈرموں کی تھاپ اب کان کے پردے پھاڑ رہی

تھی۔

عالیان کا دم گھٹ رہا تھا پھر بھی اس نے ڈریگن ماسک پہن لیا۔

اور پہلے آہستہ روی سے پھر تیزی سے پریڈ کو پیٹھ دیکھا کر بھاگنے لگا، عجیب انسان تھا وہ دو قدم پر محراب تھی اور وہ وہاں تک نہ جاسکا اور الٹی طرف بھاگنے لگا۔ اس کا ڈریگن ماسک بہت بدہیت لگنے لگا تھا اس بدہیت کو دیکھ کر ڈر قطعاً ”نہیں لگ رہا تھا اس دل مٹھی میں آیا لگتا تھا۔“

امرہ چینی ساختہ محراب کے پار ہو گئی اور پھر اس نے ہمت کر کے گردن موڑ کر دیکھا۔ کوئی بہت بے دردی سے پریڈ کو چیرتا بھاگ رہا تھا جیسے اس کے آس پاس آگ بھڑکتی ہو۔ نہیں جیسے اس کے اندر آگ لگی

اس ڈریگن نے خود کو پریڈ سے الگ کیا۔ اور لوگوں کے ہجوم میں خود کو گم کرتے۔ اپنے ماسک کے اندر ہی خود کو بلک بلک کر رونے دیا۔

امرہ نے خود کو لوگوں کی بھیڑ میں گم کر دیا۔ وہ ابھی ماسک اتارنے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔

دو لوگ خود کو بھیڑ میں گم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بھیڑ سے نکلنے کی بھی۔ الگ ہو جانے کی بھی اور مل جانے کی بھی۔ ایک وقت میں اتنی خواہشیں۔ مانچسٹر کی کشادہ سڑکوں پر پھیلی۔ ہزاروں لوگوں سے الٹی ڈریگن پریڈ ماسک جلوس کی صورت اختیار کر گئی۔

کیونکہ کیونکہ ایک ماں کی گود میں بچہ حلق پھاڑ کر رو رہا تھا اور ماں کی ساری کوشش اسے چپ کروانے میں ناکام ہو چکی تھی۔ نئے سال کی آمد اس کے لیے نیک شگون نہیں لائی تھی۔ کیا اب سارا سال اسے رونا پڑے گا؟

خیر اور بھلائی اس سے دور رہے گی۔ بلا میں اور شر اس پر حملہ آور ہوں گے۔ کیا خوش قسمتی پر اس کا کوئی

حق نہ ہوگا۔

اور کیا۔ اور کیا۔ اس کا دل خون کے آنسو روئے گا۔

خسرو کمالی نے رباب کو زریور میں پھینکا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس طرف زہرہ آفندی کی جگہ ایک شیر کھڑا تھا۔

وہ جانتا تھا اس شیر کا نظر آنا ختم ہے۔ ختم ہے۔

چینی پریڈ کے اس اور اس کنارے بھی ایک شیر اپنا منہ صاف کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ شکار کر چکا تھا۔ وہ مشرقی اکھاڑوں کا ٹگر ٹگر پایا جانے والا شیر ہے۔

\*\*\*

بانو قدسیہ کہتی ہیں ”محبت مرگ سے پہلے جنم کا نام ہے۔“

اور مجھے ایسا لگتا ہے ”محبت جنم سے پہلے مرگ کا نام بھی ہے۔“

یہ پہلے آپ کو مار ڈالتی ہے پھر جی میں آئے تو جنم دے دیتی ہے۔ یہ پہلے انگارہ بنتی ہے۔ جی میں آئے تو۔ تو گلزار۔

یہ ”م“ کا پرچار کرتی ماہی۔ ماہی۔ محبت ہے۔ یہ ”م“ سے بھیٹ لیتی۔ محبت۔ مرگ۔ مرگ۔ ہے۔

یہ محال۔

یہ محرق (جلادینے والی)۔

اور یہ محشر ہے۔

محبت ”م“ سے۔ یہ امر سے پہلے ”مرن“ ہے۔ محبت مطوق (قید کی گئی)۔

محبت مضطر۔

اور یہ محبت مشرک بھی ہے۔

وہ پاکستان ہی رہ چکی ہوتی اور اس پر ایسا برا وقت نہ

آیا ہوتا۔ کاش پاکستان میں سب اس کے لیے ٹھیک ہوتا۔ اسے اپنے ماحول سے نکل بھاگنے کی تمنا نہ ہوتی،



۔ اسے یہاں آنے کی چاہ نہ ہوتی۔ وہ شخص جو اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں اندر باہر ہر طرف تھا۔ جو ہر طرف سے اسے اپنی طرف آتا نظر آتا تھا۔ وہ شخص اسے ساری زندگی نہ ملا ہوتا۔

لیکن وقت کی کمان میں اس کی اپنی مرضی کے تیر ہوتے ہیں اور وہ انہیں اپنی مرضی سے تاک کر چھوڑتا ہے۔ وہ ایک آنکھ میچے۔ سانس گم کیے۔ نشانہ باندھے بیٹھتا ہے۔ اپنے من پسند وقت۔ یہ چھوڑا۔ اور شکار چیت۔

اب اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ خاموش رہے اور سب سے دور بھی۔ تعلیم مکمل کرے۔ اور گھر جائے۔ اور یہی سب ہونا تھا۔ اسی اور خاموشی کو لیے چند دن گزر گئے۔ اور بقول بانو قدسیہ ”مسکراہٹ سمیت وہ غائب ہونے کا فن جانتا تھا۔“

عالیان فن کار اسے ان چند دنوں میں کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے اسے ڈھونڈنا نہیں چاہا تھا۔ پھر بھی۔ وہ غائب ہونے کا فن سیکھ چکا تھا۔ ”تم بہت اداس رہتی ہو؟“ ویرا پوچھ رہی تھی وہ سونے کی تیاری کرنے ہی والی تھی بس۔ وہ کھڑکی کے سامنے بیٹھی تھی۔ سونے کے لیے اٹھ ہی نہیں رہی تھی۔

”نہیں! میں ٹھیک ہوں۔“  
”میں نے کب کہا تم ٹھیک نہیں ہو۔ ریڈ میں“  
عالیان آیا تھا تمہارے پاس۔ شاید اس نے کچھ کہا تھا تم سے۔ ”ویرا اس کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔“  
”کیا کلمے گاؤ؟“ امرجہ نے کتاب جو سامنے رکھی تھی اور پچھلے کئی گھنٹوں سے رکھی تھی کو پڑھنے کی کوشش کی۔

”کچھ بھی کہہ سکتا ہے وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔ بعد میں میں نے اسے بہت اداس ہو کر جاتے دیکھا۔“  
ویرا واقعی موساد کی خفیہ ایجنٹ تھی اتنے رش میں بھی اس نے یہ سب نوٹ کر لیا تھا۔

امرجہ ویرا کو دیکھنے لگی۔

”تم خاموش کیوں ہو امرجہ؟“

”اس نے کہا وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“

”اوہ۔ اور تم نے کیا کہا؟“ ویرا مسکرائی۔

”میں نے؟“ سوال تھا یا اقرار۔

”ہاں ظاہر ہے تم نے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے مجھے لگا۔ وہ تمہارا اچھا دوست بننا چاہتا ہے لیکن اسے کچھ اور ہی بننا تھا۔“ مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”میری منگنی پاکستان میں ہو چکی ہے۔ میرے جاتے ہی میری شادی ہو جائے گی۔“

”تمہاری منگنی۔ تمہاری منگنی ہو چکی ہے؟“

”نہیں۔“ امرجہ نے اداسی سے کہا۔

”تو تم نے جھوٹ بولا عالیان سے۔ تم نے ایسا کیوں کیا امرجہ؟“

”جو مجھے مناسب لگائیں نے کہہ دیا۔ بس۔“

”بس؟“ ویرا حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”تم عالیان کے لیے ایسے بات کر رہی ہو۔“

”کیسے بات کر رہی ہوں؟“

”اپنا انداز دیکھو امرجہ۔ اتنی بڑی یونیورسٹی میں وہ تمہارے پاس آتا ہے باتیں کرنے کے لیے۔ عالیان۔

اپنا انداز دیکھو۔ جانتی ہو کون ہے عالیان۔ پروفیسرز کے بعد یونی کی آنکھ کا تارا ہے۔ جس طرح

جج یونیورسٹی کیپس کے پاس کھڑا ہو کر تمہارا انتظار کرتا ہے کبھی دیکھا ہے؟“

”میں نے اسے کبھی نہیں کہا انتظار کرنے کے لیے۔“

”ایک صبح صبح بائے کہنے کے لیے وہ ہم سے دس پندرہ منٹ پہلے وہاں کھڑا ہوتا ہے۔“

”میں اسے ایسا کرنے کے لیے نہیں کہتی۔“

”تم کم عقل ہو۔“

”میں کم عقل ہوں۔“

”تم نا سمجھ ہو بہت۔“

”میں بہت نا سمجھ ہوں۔“

”شٹ اپ۔ تم نے اپنی منگنی کا جھوٹ کیوں بولا؟“

”تم تو سیدھے سیدھے عالیان کی بے عزتی کر رہی ہو۔“  
”یہ سب اتنا آسان نہیں ہے جتنی آسانی سے تم مذاق اڑا رہی ہو۔“ امرجہ نے بے بسی سے ویرا کو دیکھا۔

”میری مرضی۔“  
ویرا نے تھوڑی دیر اس کی طرف دیکھا۔ ایک شخص تمہیں پر پوز کر رہا ہے امرجہ! اور تم نے مناسب الفاظ میں اسے ٹال دیا۔“ ویرا تالی ہار کر طنزیہ ہنسی۔

امرجہ کے جیسے کسی نے گل پر پھڑکے مارا۔  
”تم صاف انکار کر دیتیں اسے۔ ایسے بہانے اس کی انسٹلٹ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“ اس

روی ویرا کو سمجھانا بہت مشکل تھا۔  
”بہت عجیب ہو تم۔ بہت زیادہ۔ اتنے ذہین انسان کو کیسے تم نے جھوٹ بول کر انکار کر دیا۔“

ویرا تو عالیان کی ذہانت کی فین تھی۔  
ویرا نے ایک بار اور تالی بجائی۔

”ٹینگ لیڈی آف پاکستان۔ دی گرٹ لیڈی۔“  
ہونہ۔

امرجہ کا منہ سرخ ہو گیا وہ روپنے کو ہو گئی۔  
”کیسے نہ کرتی میں انکار۔ پتا نہیں کون ہے وہ۔“

عیسائی مسلمان یا یہودی۔ مارگرٹ اس کی ماں کا نام ہے تو باپ کا کیا ہو گا۔ آنرک۔ داؤد۔ کیا ہو گا۔“

امرجہ تیز آواز میں چلا اٹھی اسے ویرا کے انداز سے تکلیف پہنچی تھی۔  
ویرا خاموش ہو کر اسے دیکھتی رہی۔

”اتنی معمولی سی وجہ کے لیے؟“  
”معمولی وجہ نہیں ہے یہ ویرا۔ نہیں ہے یہ سب معمولی۔ اس کے باپ کا خاندان کا کوئی اتنا پتا نہیں ہے۔ وہ کون ہے۔ وہ خود بھی نہیں جانتا ہو گا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے؟“ ویرا کی آواز تیز ہو گئی۔

”یورپ کے آزاد معاشرے کی دین۔ غیر مذہبی۔ غیر اخلاقی اقدام کی پیداوار۔ معمولی باتیں نہیں ہیں یہ سب۔ میرے خاندان کے لیے طمانچے جیسی باتیں ہوں گی یہ سب۔“

”طمانچہ!“ ویرا استہزائیہ ہنسی ”خاندان۔ واؤ۔“

”گلد۔ پھر مسئلہ کیا ہے؟“ امرجہ پھر سے خاموش ہو گئی۔

”اوہ۔ اچھا وہ اکیلا ہے۔ اس کے باپ کا پتا نہیں۔“  
وہ ناجائز ہو سکتا ہے اس لیے۔ اوہ۔ واؤ۔ اس کے



ناجائز ہونے سے مسئلہ ہے۔ اگر وہ ناجائز نہ ہوا امرحہ  
"تو تو؟"  
"تو بھی نہیں۔ نہیں وہ مجھے نہیں پسند۔ میں  
نے انکار کر دیا۔" امرحہ کو یہ جواب سب سے زیادہ  
مناسب لگا۔

"شاید تم اسے پسند کرنے لگو؟"  
"میں اسے پسند نہیں کر سکتی۔ وہ میرا اچھا دوست  
ہے۔ جیسے تم ہو۔"

"شاید تم اسے پسند کرنے لگو۔" ویرا سنجیدگی اور  
سختی سے اپنی بات دہرا رہی تھی یا شاید تم اسے پسند  
بھی کرتی ہو لیکن اپنے خاندان کے لیے۔ اپنے  
معاشرے اپنی روایات کے لیے۔"

"میں اسے کیوں پسند کروں گی۔ کیوں کروں گی۔  
کون سی خبیث ہے اس میں؟ اگر وہ قاتل ہے تو یونی میں  
ہزاروں اور بھی ہیں۔ مجھے اسے ہاں کہنے کے لیے  
مجبور نہیں کیا جاسکتا۔"

"تم مجھے مطمئن کرو امرحہ۔ مجھے اس سب کی  
سمجھ نہیں آرہی۔" ویرا جم کر کھڑی ہو گئی۔

"شاید تمہارا خیال ہے کہ اگر وہ مسلمان ہے بھی تو  
تم جتنا اچھا انسان نہیں ہے۔ وہ تمہاری طرح عبادت  
نہیں کرتا ہو گا۔ تمہاری طرح حلال فوڈ کا استعمال  
نہیں کرتا ہو گا۔ اسے بنیادی مذہبی تعلیمات کے  
بارے میں نہیں معلوم ہو گا۔ اور اگر وہ تمہارے  
خاندان کے پاس جاتا ہی ہے تمہارا ہاتھ مانگے تو اسے  
ان سب باتوں کی وجہ سے روکیا جاسکتا ہے۔ ہے نا  
امرحہ۔؟"

امرحہ خاموش رہی۔

"جواب دو امرحہ۔"

"ہاں! امرحہ چلا اٹھی۔" تم ٹھیک کہہ رہی ہو  
۔ اتنا آسان نہیں ہے یہ سب۔ بہت مشکل ہے یہ  
سب۔"

"تم لوگ یورپ میں رہنے والوں کے بارے میں  
یہی سب سوچتے ہو نہیں جانتی ہوں۔ تمہیں لگتا ہے  
اقدار صرف تمہارے مشرقی ملکوں میں ہی ہیں۔"

روایات اور مذہب کی پاسداری بھی۔" ویرا اب  
باقاعدہ اسے ذلیل کر رہی تھی۔

"اور کیا بچ نہیں ہے یہ۔ کیا نام ہے عالیان کے  
فادر کا۔ اس کا سر نیم مار گریٹ کیوں ہے؟"  
"تم اس سے پوچھ لو۔"

"میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اور تم  
جاؤ۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم عالیان کی اتنی بڑی  
حمایتی ہو۔" امرحہ بھڑک اٹھی۔

"اگر تم غور کرو تو میں تم دونوں کی حمایت کر رہی  
ہوں۔ لیکن تم لوگ بہت نا سمجھ ہوتے ہو۔"  
"ہم کون؟" امرحہ کی تیوری چڑھ گئی۔

"تمہارے ملک پر طنز نہیں کر رہی امرحہ۔ تم  
لوگ یعنی تم جیسے کم عقل لوگ، سطحی لوگ۔ روایات،  
معاشرے کے علم بردار۔"

"بس بہت ہو گئی اب جاؤ۔ میں نے جو کرنا تھا کر  
لیا۔"

ویرا اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اور چلی گئی۔  
کھڑکی میں کھڑی وہ اندھیری رات کے گہرے  
اندھیروں کو دیکھتی رہی ویرا اسے اس نے جان چھڑائی  
تھی اب خود سے کیسے چھڑائے گی۔ دنیا بھر سے چھپ  
کر بیٹھا جاسکتا ہے ایک اپنے آپ سے چھپ کر رہنے  
کی جگہ نہیں ملتی۔ دنیا بھر سے کیا کچھ نہیں کہہ دیا  
جاتا ایک اپنے آپ سے کہنے کے لیے ہی کوئی لفظ  
نہیں ملتا۔

تو کیا محبت جہنم سے پہلے مرگ نہیں۔؟

\*\*\*

ہفتے کی رات ہے۔ اور یہ ہارٹ راک کیفے کا  
ڈانس فلور ہے۔ ڈی جے اپنے میوزک کے ساتھ  
تجربات کرنے سے پہلے ایک خاص ڈسک کو پلے کرنا  
چاہ رہا ہے۔ یہ ڈسک اسے باریئڈر کارل نے دی  
ہے۔ کیفے میں یونیورسٹی اسٹوڈنٹس کی بھرمار ہے۔  
خاص کر بزنس اسکول کے اسٹوڈنٹس کی۔ ڈانس فلور  
پر ڈانس شروع ہوا ہی جاتا ہے کارل کاک ٹیل بنا رہا

ہے۔ عالیان ابھی ابھی اس کے سامنے رکھی اونچی  
کرسی پر نیم دلی سے آکر بیٹھا ہے۔ اسے کارل نے  
کچن سے بلایا ہے ڈی جے نے ڈسک پلے کر دی ہے۔  
"تمہاری ممکنہ ہو چکی ہے؟"  
"نہیں۔"

"تم نے جھوٹ بولا عالیان سے۔؟"  
"جو مجھے مناسب لگا میں نے کہہ دیا۔ کیسے نہ انکار  
کرتی پتا نہیں کون ہے۔ وہ مار گریٹ اس کی ماں کا نام  
ہے تو باپ کا کیا ہو گا۔ آئزک۔ داؤد۔"

"اتنی معمولی سی وجہ کے لیے۔؟"  
"معمولی وجہ نہیں ہے یہ۔ میں اسے پسند نہیں  
کرتی۔ کون سی خبیث ہے۔ اس میں۔ مجھے اسے ہاں  
کہنے کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔"

"شاید تمہارا خیال ہے کہ وہ مسلمان ہے بھی تو تم  
جتنا اچھا مسلمان نہیں ہے۔"

"ہاں! تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ کیا نام ہے عالیان  
کے؟" فادر کا۔ اس کا سر نیم مار گریٹ کیوں ہے۔"

"وہ ناجائز نہ ہو سکتا ہے اس لیے بھی؟"  
"ہاں! ہاں۔"

"تمہاری طرح، حلال فوڈ کا استعمال نہیں کرتا ہو گا  
اس لیے بھی۔؟"  
"ہاں!۔"

وہاں موجود ایک ایک اسٹوڈنٹ عالیان مار گریٹ  
کی طرف گردن موڑے دیکھ رہا تھا۔ کارل نے ایک  
آنکھ دبا لی اور منہ بنا کر بھڑکیے کی آواز نکالی، لیکن  
عالیان نہ وہاں موجود یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کو دیکھ رہا  
تھا نہ ہی کارل کو۔ وہ اپنے جوتوں کی نوک کو گھور رہا تھا،  
۔ اسے آج معلوم ہوا تھا۔ ایک دم سے کیسے کرسی پر  
بیٹھے بیٹھے آپ جوتے کی نوک تلے آجاتے ہیں۔

اس کے منہ پر کبھی کسی نے پھٹ نہیں مارا تھا اس  
کے سرخ ہوتے منہ پر آج پھپھو کی بو چھاڑ کر دی گئی  
تھی۔

کاک ٹیل بناتے کارل کے ہاتھ رک گئے۔ عالیان  
کارڈ عمل اس کی توقع کے برخلاف تھا۔ اس نے اٹھ

کر اسے گھونسا نہیں مارا تھا۔ وہ مسلسل اپنے جوتوں کی  
نوک کو دیکھ رہا تھا۔  
اس کھیل کے وہ بچے دشمن تھے۔ ویسے وہ دوست  
تھے؟

"عالیان۔! کارل نے اسے آواز دی۔  
عالیان نے جوتے کی نوک سے نظریں اٹھا کر اسے  
دیکھا۔

"شکریہ کارل۔ میں تمہارا یہ احسان تا عمر نہیں  
بھولوں گا۔" وہ اٹھا اور قدم گھسنے لگا۔  
"وہ ناجائز ہو سکتا ہے اس کیسے بھی۔"

"ہاں!۔"  
"نہیں وہ مجھے نہیں پسند۔ کیا نام ہے عالیان کے  
فادر کا۔"

اس نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ لیکن پھر بھی وہ  
بہرا نہیں ہوا۔ محبت کی زبان اسی وقت تو بولتی ہے،  
جب اس کے گونگا ہو جانے کی دعا کی جاتی ہے۔ اور  
محبت کے کلن اسی وقت تو سب سننے لگتے ہیں جب ان  
کے سرے ہو جانے کی بد دعا کی جاتی ہے۔

اور یہ محرق ہے۔ محبت۔  
کیا نام ہے عالیان کے فادر کا۔ کیا نام ہے۔ فادر  
۔ اس کا سر نیم مار گریٹ کیوں ہے؟ فادر۔ فادر۔  
تختیں لالہ صبح بہارم، پیاپے سوزم از داغے کہ

دارم  
(صبح بہار کا پہلا لالے کا پھول ہوں جو عشق  
کے داغ سے مسلسل تڑپ رہا ہوں)  
محبت جگا جوت ہے جسے مٹھی میں کر کے آنکھوں  
کے سامنے رکھ لیتا آسان نہیں۔ آنکھیں نہیں  
چند حیا میں قسمت چند حیا جاتی ہے۔ وہ اتنی جلدی  
کہاں مہربان ہوتی ہے۔

انسان سب سے زیادہ خواب محبت کے دکھتا ہے۔  
انسان پر سب سے زیادہ خواب محبت کے بھاری  
پڑتے ہیں۔

انسان کسی بھی مزاج یا نسل سے تعلق رکھتا ہو،  
محبت کی اتنی سمجھ بوجھ ضرور رکھتا ہے کہ دعا کے لیے



باقاعدہ ہاتھ اٹھائے نہ اٹھائے اندر ہی اندر اتنی آرزو ضرور کرتا ہے کہ کائنات میں چھپا کر رکھی گئی ساری محبت اس کی جھولی میں ڈال دی جائے۔ کہ نہ کہے پر اتنا ضرور سوچتا ہے کہ محبت کو وہ کچھ بھی کر کے چرائی لائے۔

ساری محبت چرائی لینے کا خواب عالیاں مارگریٹ نے بھی دیکھا تھا۔ اور یہ خواب اس پر بہت بھاری گزرا تھا۔ کیونکہ محبت وہ شجر ممنوع بھی تو ہے جو جھولی پھیلوا کر مست مست مانچ نچواتی ہے اور پھر بھی دہن کھول کر در شہوار کے درشن نہیں کرواتی۔

جھولی پھیلانے رقص یا رقص کے رقص اپنے پیر جلا بیٹھے ہیں تب بھی نہیں۔ بس نہیں۔

وہ اپنا تن من بھسم کر ڈالتے ہیں تب بھی۔ نہیں۔ وہ خود کو گھسیٹ رہا ہے۔ جس برف نے مانچسٹر کو اپنی ہتھیلیوں میں لے رکھا تھا وہ اسے گرنا دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن اسے دیکھنا تھا کہ چلتے چلتے کیسے گرا سا جاتا ہے۔

برف میں ایک قلندری خاصیت بہت کمال کی ہے۔ یہ گرتی ہے تو شور نہیں مچاتی۔ گر کر پکھل کر ختم ہو جاتی ہے تو بھی واویلا نہیں کرتی۔ برف اپنے سینے پر رزتے گر جاتے اس کے قدموں میں یہ خاصیت محفل کرونا چاہتی تھی۔

مانچسٹر کی اتنے سالوں دیکھی بھالی سردی میں اب عالیاں کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کی ناک بے حد سرخ ہو چکی تھی۔ اور آنکھیں بھی سردی سے نہیں صدمے سے۔ اس کی بھوری بچوں سی چمک لیے آنکھیں بھر آئی تھیں۔ انسان تھا نا۔ رونا تو بنتا تھا۔

محبت کا سنرا خواب جو دیکھ لیا تھا۔ خواب کے ٹوٹ جانے پر ٹوٹا تو بنتا تھا۔ آسمان کے سارے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر مانچسٹر کی شاہراہوں پر بکھر رہے تھے۔ کائناتی محبت پر۔ کائنات کا ٹوٹ پھوٹ جانا تو بنتا ہے۔

سڑک پر چلتے وہ ایک بند گلی کے کنارے رک گیا۔ جس کے اندر ایک بڑا کوڑا دان رکھا تھا۔ وہ اندھیرے

میں کوڑے دان کے پیچھے جا کر دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اپنی پہلی محبت یاد آ رہی تھی۔

”مارگریٹ جوزف۔ اس کی ماں جو اس کی بھوری آنکھوں کو اپنی نیلی آنکھوں سے گھنوں دیکھا کرتی تھی۔ اور جیسے خاموشی کی زبان سے کہتی جاتی ”مجھے کیا معلوم تھا یہ آنکھیں مجھے ایسے لے ڈوبیں گی۔ لیکن میں خوش ہوں کہ یہ مجھے لے ڈوبیں۔ میں شکر گزار ہوں کہ مجھے یہ آنکھیں عطا کی گئیں۔ میں ان میں اپنی صورت دیکھ سکتی ہوں۔ میں کیسے نہ شکر گزار ہوں۔“ اس کی آنکھیں اس کے لبنانی باپ جیسی تھیں۔ وہ مارگریٹ کے مرہ ہوئے وجود میں جان ڈال دینے والی آنکھیں تھیں۔ وہ انہیں گھنوں کیوں نہ دیکھا کرتی۔

وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک کمرے کے نسبتاً گندے سے فلیٹ میں رہتا تھا جس کے ایک کونے میں بچن تھا اور دوسرے کونے میں واش روم۔ بیڈ کمرے کے دروازے کے عین سامنے تھا۔ ایک کھڑکی تھی جس کے آگے ایک کرسی دھری رہتی تھی۔ اس کرسی پر کھڑے ہو کر عالیاں کھڑکی سے سر نکا کر اپنی ماں کی راہ دیکھا کرتا تھا۔ مارگریٹ کے انتظار میں اس نے اپنی آنکھوں کو بہت تھکایا تھا۔

کمرے میں بچن اور واش روم کی بو ہمہ وقت رہتی رہتی تھی لیکن یہ فلیٹ اس وقت مہک اٹھا جب مارگریٹ آکر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیتی۔ مارگریٹ جو ایک ہسپتال میں صفائی پر مامور تھی اس کے جسم سے کئی طرح کے کیمیکل کی بو آتی۔ مگر یہ بو عالیاں کے لیے دنیا کی بہترین خوشبوؤں سے بڑھ کر تھی۔

مارگریٹ جوزف مسکرائے کی کوشش کیا کرتی تھی لیکن وہ ایک بری اداکارہ تھی۔ اس نے زندگی کو زندہ دلان ہمت جوان مودی سے گزارنے کے کچھ اقوال رٹ رکھے تھے۔ وہ انہیں ہر روز دہراتی اور مسکرائے کی بھدی اداکاری کرتی اپنے کام پر چلی جاتی۔ مسکرا کر گھر کا دروازہ بند کرتی۔ گھولتی۔ روز کی اداکاری۔ زندگی اقوال پر کامیاب ضرور کی جاسکتی ہے خوش طالع

نہیں۔ ایسی زندگی کو سیاہی سے تو پچایا جاسکتا ہے لیکن ست رنگی نہیں رنگا جاسکتا۔ یہ دھنک جلی تو ہو سکتی ہے دھنک ڈھلی نہیں۔

یہ اس زمزمے کی صورت اختیار کر لیتی ہے جو دل کے کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتی ہے۔ ایسی زندگی زندگی تو نہیں ہوتی۔ کیونکہ وجود میں دھرا لو کھڑا چت ہو جاتا ہے۔ یہ لو کھڑا جو دل ہے۔ اور جس دھوکے باز بزدل کا کوئی علاج نہیں۔ یہ غداری کرتا ہے۔ اور اس غداری پر اسے موت کی سزا ملتی ہے۔ تو مارگریٹ اقوال پر زندگی گزارنے کی کوشش کرتی رہی اور لحاف میں منہ دے کر روتی رہی۔ اس نے زندگی کی ایک فاش غلطی کر ڈالی تھی۔ اس نے ایک مسلمان سے محبت کر لی تھی۔ ایک ایسا لبنانی مسلمان جو وہاں کام کے لیے آیا تھا۔ پونڈز کے لیے۔ محبت کے لیے نہیں۔ وہ اس روایت کا پاس دار تھا کہ سفر کے دوران گاڑی کے نئے اور انوکھے اسٹیشنوں پر رک جانے کو دل پر نہیں لینا چاہیے۔ سفر میں اسٹیشن تو آتے ہی رہتے ہیں۔ تو کیا سفر کو ہی روک دیا جائے۔ وہ سمجھ دار تھا۔ اس نے سفر کو نہیں روکا۔

نہلی آنکھوں پر چروں سے تو دنیا بھری پڑی ہے۔ کس چیز کی کمی ہے اس جہان میں۔ پھر ایک انسان کے لیے زندگی تباہ کر لینا کہاں کی روایت ہے۔ اگر ہے بھی تو ہم نہیں مانتے ان روایات کو۔ سب قصے کہانیاں ہیں۔

اس کی چھ سالہ زندگی اپنی ماں کی دہلی سسکیاں سننے گزری۔ وہ سمجھتی تھی وہ سو رہا ہے۔ پر ایسی آہوں کے سائے تلے سو جانا گناہ کے مترادف ہوتا۔ وہ دن بھر کام کرتی۔ رات بھر روتی۔ ایسی حالت میں وہ زیادہ دیر تک زندہ کیسے رہتی۔ کیونکر زندہ رہتی۔ جو انسان بچن میں کام کرتا۔ بیڈ پر لیٹا کھڑکی میں کھڑا دروازے پر نظریں رکھے خود کو پھرالے۔ وہ زندہ رہ کر زندہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔ ایسے انسان کو تو جلد مرجانا چاہیے۔ جس کا لو کھڑا دل خون بنانے کے بجائے۔

خون اگلنے لگے، ایسے لو کھڑے کے مالک کو جلد ہی مر جانا چاہیے۔

جس چھٹی تکلیف وہ یاد کو عالیاں مارگریٹ کو اپنے دماغ میں زندہ رکھتا تھا وہ کچھ یوں تھی کہ کمرے کی واحد کھڑکی کے آگے رکھی کرسی پر کھڑا وہ نیچے جھانک کر اپنی ماں کو تلاش رہا تھا۔ نیچے ایک مصروف سڑک تھی جس پر چھوٹی چھوٹی کئی دوکانیں اور اسٹورز واقع تھے۔ مارگریٹ تھکی تھکی اس سڑک پر چلتی اسے نظر آ گئی۔ وہ اندر آئی اور بیڈ پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگی۔ پھر چل کر اس کے پاس آئی اور وہی اپنی اداکارانہ مسکراہٹ سے اسے دیکھا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا جبکہ خود وہ کرسی کے پاس گھنوں کے بل بیٹھ گئی۔ ”تم بہادر ہو نا۔“ مارگریٹ نے ایک اچھی مسکراہٹ سجا کر پوچھا۔

جب عالیاں تھوڑا بڑا ہوا تو اس نے کئی سالوں تک خود کو ہڑا کر اٹھتے اور کہتے سنا۔ ”نہیں! میں بہادر نہیں ہوں۔“

وہ تنہا لوگ جب ایک دوسرے سے یہ پوچھنے کی جرات کرتے ہیں تو حقیقتاً ”وہ یہ کہنا چاہ رہے ہوتے ہیں کہ“ اب تیار ہو جاؤ۔ تم بہادر ہو یا نہیں۔ تمہیں بہادری دکھانی ہوگی، تلخ حقیقتیں تمہاری رسیلی زندگی میں گھلنے کے لیے تیار ہیں۔ کیا تم بھی تیار ہو؟

اپنی بھوری آنکھوں سے وہ مارگریٹ کو دیکھنے لگا۔ ہاں کی تائیاں۔

”مامی! کیا کے پاس جا رہی ہیں۔“ مارگریٹ نے اس کے گل پر پیار کیا اور کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ دیکھا۔ وہ ایک بری اداکارہ تھی۔ زیادہ دیر تک مسکرا نہ سکی۔ پھر بہت دیر کے بعد وہ وہاں سے ہٹی اور ایک چھوٹے سے بیگ میں اس کے کپڑے رکھنے لگی۔ ایک دوسرے سفری بیگ میں اس نے اپنی ایک جینز اور دو شرٹس رکھیں۔ دونوں بیگ اٹھا کر اور اس کا ہاتھ تھام کر وہ اسے اپنی دوست کے پاس لے آئی اور اس کے گل چوم کر چلی گئی۔



کوشش کی۔ کس کس شخص کے پاس اس کا پوچھنے کے لیے گئی۔ خدا کے آگے کیسے کیسے گزرانی اور اسے یاد کر کے کیسے کیسے روٹی رہی اس نے کیا کیا۔ اس نے جیب سے ایک کانڈ نکالا اور کہا۔

”یہ تمہاری طلاق کے کانڈ ہیں۔ میں نے اپنے مذہبی اسکالر سے اس کی تصدیق کروالی ہے۔ تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہوگی، لیکن مجھے ہے۔ تم دستخط کر دو۔“ پھر اس نے ایک لفافہ میرے آگے کیا اور کہا۔

”یہ لو پیسے اور واپس جاؤ۔ میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا لعنتی کافر عورت!“ اسے بے طرح حیا د کرنے پر وہ مجھے طلاق دے رہا تھا۔

اس کے لیے میں خدا کے آگے کیسے کیسے گزرانی یہ سن کر وہ مجھے لعنتی کہہ رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اس پر اللہ کا غضب نازل ہوا تھا۔ جو اس نے ایک کافر عورت سے شادی کر لی۔ وہ تعلق ایک لعنت تھا۔ میں سو سن اس نے کہا میں ایک لعنت ہوں۔ میں اللہ نے تو مجھے بھی بنایا ہے اور اسے بھی۔ کیا اللہ لعنتیں بناتا ہے۔ کیا اللہ ایسا نا انصاف ہے کہ ایک کو اس جیسا انسان بناتا ہے اور ایک کو مجھ جیسا۔ اس نے کہا میں ایک کافر عورت ہوں۔ وہ کافر کسے کہتا تھا۔ خدا کو نہ ماننے والے کو۔ خدا کو چھوڑ دینے والے کو۔ اور ایک انسان کو چھوڑ دینے والے کو۔ ایک انسان کو نہ ماننے والے کو کیا کہتا ہے وہ۔ میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے مجھے گالیاں دیں۔ میرے مرے ہوئے والدین پر الزام لگایا۔ کہ میں حرام کی پیداوار ہوں۔ میں سر پاپا حرام ہوں۔ میری رگوں میں ناجائز اور گندا خون ہے۔ میں اور میرے آباؤ اجداد شراب پیتے رہے ہیں اور میرے والدین کو شادی کی کیا ضرورت رہی ہوگی۔ میں ایک گندے غلیظ مغربی معاشرے کی پیداوار، کتنے کتنے گل کھلا چکی ہوں گی، وہ گالیاں دیتا رہا اور مجھے بتاتا رہا کہ میں کیا کیا ہوں۔ وہ مجھے جتا رہا تھا کہ مجھے چھوڑ آنے کی اصل وجوہات کیا تھیں، وہ میرا کافر

مار گریٹ چلی گئی۔ اور کتنی ہی صدیوں بعد واپس آئی۔ اتنی صدیوں بعد کہ عالیاں نے جان لیا کہ اس کی ماں سوتے، جاگتے، کام کرتے، خاموش بیٹھے، سسکتی کیوں رہتی تھی اور مسکرانے میں وہ اتنی بری اداکارہ کیوں تھی اور یہ بھی کہ اس کی نظریں کن ویرانوں میں بھٹکا کرتی تھیں اور اس کے وجود سے آپیں کیسے اور کیونکر نکلتا کرتی تھیں۔ جب وہ آئی تو وہ سو سن آئی کے گھر کے پچھواڑے میں ایک طرف بیٹھا کھیلنے بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان بچوں نے کئی بار اسے کھلانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ اپنی ماں پر ہی گیا تھا۔ وہ ایک برا کھلاڑی تھا۔ وہ کھیل کو کھیل نہیں سکتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے جیسے اسے خبر ہی ہو گئی کہ اس کی ماں کیسے اس کے قریب ہے۔ وہ گھر کے اندر آیا۔ دور سے ہی اس نے مار گریٹ جوزف کی ہچکیوں کو سن لیا۔ وہ ساری اداکاری کو بالائے طاق رکھ کر رو رہی تھی۔

”ہاں! وہ مجھے نظر آ گیا تھا۔ وہ مجھے مل گیا تھا۔ تین ہفتے میں اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈتی رہی۔ اس کے دوست نے کہا تھا۔ مجھے چند ماہ بھی رکنا پڑے تو میں وہیں رکوں۔ وہ وہیں ملے گا۔ اور وہ مل گیا۔ اور اس نے اس نے جیسے مجھے دیکھ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ قیمتی کپڑے پنے سڑک پر چل رہا تھا، مجھے ان دیکھا کر کے وہ تیزی سے وہاں سے غائب ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے بھاگی۔ لیکن اتنی جلدی نجانے وہ کہاں گم ہو گیا تھا۔ سڑک پر ادھر ادھر بھاگتے میں چلا رہی تھی۔ اور سو سن! پھر بھاگتے بھاگتے میں نے خود کو گرا لیا۔ کہ شاید کسی کونے میں خود کو چھپا کر مجھے دیکھتے وہ مجھ پر ترس کھا کر ہی آجائے۔ میں گری ہی رہی اور روتی ہی رہی لیکن وہ نہیں آیا۔ نہیں آیا وہ۔ اگلے دن وہ میرے ہو مل آیا۔ دیکھو کتنا آسان تھا اس کے لیے مجھے ڈنمارک میں ڈھونڈ لینا۔ اور میں اتنے سالوں میں اسے دنیا بھر میں نہ ڈھونڈ سکی۔ میں بہت ناکارہ، بہت بے کار ہوں نا سو سن! جانتی ہو میرے دو گھنٹے رونے کے بعد اور یہ بتانے کے بعد کہ پچھلے چار سالوں میں میں نے کیسے کیسے اس سے رابطہ کرنے کی

معلوم ہوتا۔ میں اس سے ایسی محبت کرنے لگوں گی کاش مجھے یہ بھی معلوم ہوتا۔ اور کاش وہ کھویا ہی رہتا۔ میں ساری عمر اسے ڈھونڈتی ہی رہتی۔ میری آنکھیں اس کے انتظار میں تھک کر مر رہی ہو جاتیں لیکن ایسے ذیل نہ ہوتیں۔ اس کی زبان سے نکلا زہر میرے کان میں نہ ٹپکا ہوتا۔ سو سن! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ ہاتھ کی پشت کو ہونٹوں سے لگانے والا جب ان ہی ہونٹوں سے تھوکتا ہے تو کرب کا کیسا لاوا وجود میں پھٹتا ہے۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں۔“

مار گریٹ نے اپنے وجود کو اپنے ہاتھوں میں لپیٹنا چاہا۔ وہ ایسے تڑپ رہی تھی جیسے اس پر بوند بوند تیزاب ٹپکایا جا رہا ہو اور اس کے پاس نکل بھاگنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔

دیوار کی اوٹ میں کھڑے اس بچے نے اس تیزاب کی بوائے ناک میں گھستے محسوس کی۔

”میں اس بھری دنیا میں جا کر کسے بتاؤں کہ اس نے مار گریٹ نامی شاہکار کی پر وہ کشائی کیسے کی۔ کاش میں اسے کبھی نہ ڈھونڈ پاتی۔ میں نے اسے ڈھونڈ نکالنے کا گناہ کیوں کیا۔ میں نے گناہ ہی کیا۔ اگر اسے یہ سب کہنا ہی تھا تو وہ مجھے برطانیہ میں ہی کہہ کر چلا جاتا۔ وہ کانڈ جو وہ اپنے مذہبی اسکالر سے تصدیق کروا لایا تھا، مجھے وہیں دے کر چلا جاتا لیکن اس کو مجھے خوار کرنا تھا، اسے میں پہلے لعنت کیوں نہیں لگی۔ اسے مجھ جیسی کافر عورت کے سر پر منڈلا نا خدائی تہ پہلے دکھائی کیوں نہیں دیا۔ ملک بدلتے ہی اسے اتنی عقل آگئی۔ ایک امیر بیوہ کے ساتھ شادی کرنے کے بعد اسے میری اوقات یاد آگئی؟

مجھے سب کہا کرتے تھے یہ علی دس شادیاں کر لیں تو پلیٹ کر کسی ایک کی طرف بھی نہیں دیکھتے۔ پر میں نے کسی کا اعتبار نہیں کیا۔ میں نے اس کا اعتبار کیا جس نے مجھے دھتکار دیا۔ اس نے تو مجھ سے بوندز کے لیے گرین کارڈ کے لیے بھی شادی نہیں کی تھی۔ اس نے تو مجھے زندہ درگور کرنے کے لیے سب کیا تھا۔ برطانیہ میں شادی کرنے والا ڈنمارک میں مجھے طلاق

ہوتا تھا۔ غیر مذہب ہوتا تھا۔ پھر اس نے میرے خدا کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ وہ مجھے بتانے لگا کہ دراصل کس کانڈ میں سچا ہے۔ خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے کہ میں ڈنمارک کی حکومت کو اپنے اور اس کے تعلق کو لے کر درمیان میں نہ لاؤں یا برطانیہ کو وہ مجھ پر یہ ثابت کرنے لگا کہ اپنی بات میں وہ کس قدر سچا ہے۔ وہ ایک سچے مذہب کو ماننے والا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ اگر اس کانڈ میں سچا ہے اچھا ہے تو اس کی وہ کس تعلیم کے تحت میرے ساتھ برا کر رہا ہے سو سن مذہب کس کا سچا ہے اس کے لیے تو آپ کو خود کو سچا ہونا پڑتا ہے نا۔ پہلے تو خود کو مکمل کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ مذہب۔ کون سا مذہب ہے جو یہ سب کرنے کی تعلیم دیتا تھا جو وہ میرے ساتھ کر رہا تھا۔ وہ سو سن کے ہاتھ پکڑ کر اس سے سوال کرنے لگی۔

”اس نے کہا وہ بھٹک گیا تھا۔ وہ میرے جال میں آ گیا تھا۔ میں نے اپنی خوب صورتی کا استعمال کیا۔ بھٹک تو میں گئی تھی۔ چھنسن تو میں گئی تھی اس کی محبت کے جال میں۔ میں کتنی خوب صورت ہوں۔ اس کا احساس تو اس نے مجھے دلایا تھا۔ وہ تو کہا کرتا تھا اللہ اپنے شاہکاروں میں مجھے بھی شمار کرتا ہو گا۔ اور وہ کہا کرتا تھا۔ اللہ کی مہربانی اس نے زمین والوں کے نصیب میں اس شاہکار کی رونمائی کی۔ مجھے شاہکار تو اس نے بنایا تھا۔ پھر اس نے مجھے لعنت کیوں بنا ڈالا۔ سو سن! میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ کوئی لعنت کے طوق کے ساتھ کیسے زندہ رہ سکتا ہے جبکہ اسے پہلے ”شاہکار“ کے رتبے پر فائز کر دیا گیا ہو۔

میرا تو سب چلا گیا نا۔ اس کا کیا گیا۔ وہ تو قیمتی لباس میں پہلے سے کہیں زیادہ خوب صورت میرے سامنے کھڑا تھا۔ جھکی ہوئی تو میں تھی اس کے آگے۔ گزرنا تو میں رہی تھی۔ بھلا بتاؤ سو سن! جو نفع میں رہتے ہیں وہ میری طرح جھک کر گزر جاتے ہیں۔ ایسے خوار ہوتے ہیں۔ خسارے میں کون رہا سو سن۔ وہ میرے ہاتھ پیر کاٹ ڈالتا۔ اس نے میرا دل میری روح کاٹ ڈالی۔ وہ اتنا ظالم ہو گا کاش! مجھے



دے رہا تھا۔ مجھے میری 'میرے والدین کی' میرے مذہب کی غلاظت کے بارے میں بتا رہا تھا اس نے ایک بار بھی میری آنکھوں سے گرتے آنسوؤں کے سیلاب کو نہ دیکھا۔ اسے یہ پرواہ بھی نہیں تھی کہ میں اس کے قدموں میں گر کر جاتی ہوں۔ میں کیسے اس کے بغیر کرب میں مبتلا رہی جان کر بھی اس نے ہمدردی سے بھی میری طرف نہ دیکھا۔ میں نے اسے اس کے بیٹے کے بارے میں بتایا تو اس نے اس بات کو اس بات کو ایسے سنا سون! جیسے میں اسے۔ میں اسے اپنے کسی بوائے فرینڈ کے بچے کے بارے میں بتا رہی ہوں۔

وہ ایک طلاق کا دکھ لے کر نہیں بیٹھی تھی۔ اسے اس طلاق کے ساتھ کئی اور تازیانے مارے گئے تھے اور غلاظت کا ڈھیر ثابت کر دیا گیا تھا۔ محبت کا پیادہ زمین بوس ہوا۔ تپسیا تمام ہوئی۔ کیونکہ محبت وہ پھنکار زدہ کنیا کماری بھی ہے جو کراتی ہے اور جوگ محبت کے شراب کی مستحق پاتی ہے۔

وہ خاموشی سے اپنی ماں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ مارگریٹ نے آنسو پونچھ لیے۔ کتنی بد صورت ہو گئی تھی وہ اتنے سے دنوں میں۔ اس کے کپڑے گندے اور بدبودار تھے۔ اس کے وجود سے ایسی بساند اٹھتی تھی جیسے کچا گوشت دھیمی آنچ پر جل رہا ہو۔ مارگریٹ کے پیٹ کے ساتھ لگے اس کا دم گھٹنے لگا۔ امرجل کی دھارا زہر آب تھی۔

زہر زہاب (ہمہ وقت جاری رہنے والا زہریلا چشمہ) نے اپنا دہن اس کے وجود میں کھول دیا تھا۔ اس میں سے بساند کیوں نہ آتی۔

اور پھر اس دن کے بعد سے اس نے اسے یہ کہنا چھوڑ دیا

کرسمس کی ان چھٹیوں میں ہم ہلز جائیں گے۔  
"سچ۔؟"  
"ہاں! اس تمہارے پاپا آجائیں۔"  
"وہ کب آئیں گے؟"

"شاید ابھی۔ آج رات۔۔۔ ورنہ کل صبح۔۔۔ میں نے انہیں خط لکھے ہیں فون بھی کیے ہیں۔"  
"وہ گندے ہیں۔۔۔ وہ نہیں آتے۔"  
"وہ اچھے ہیں۔۔۔ وہ آجائیں گے۔"  
وہ اتنا اچھا تھا کہ ایک بار بھی نہیں آیا تھا اس نے اپنی اولاد کو بھی دیکھنے کی چاہ نہ کی۔ اس کو پتا ہی نہیں تھا کہ اس کے بیٹے کی آنکھیں اس جیسی ہیں۔ کچھ بڑے اس جیسے نقوش۔ گھنی بھنوں۔ گھنی پلکیں۔ سفید رنگت میں مبہم گندی رنگت کی جھلک۔

مغرب میں عرب کھلتا ہوا۔  
عرب پر مغرب چھاتا ہوا۔  
وہ ایسا تھا۔ جس کے دنیا میں آنے سے پہلے ہی اس کے باپ نے خود کو دنیا میں چھپا لیا تھا۔ اور مارگریٹ آخر تک یہ جان نہ سکی کہ جو گم ہو جاتے ہیں ڈھونڈا انہیں جاتا ہے۔ جو خود کو چھپا لیں انہیں ڈھونڈ نکالنا تندرل ہے۔ تندرل۔ گندہ عظیم۔ ایسے گناہوں سے خود کو بچانا چاہیے۔

تو ایسے چھپ چکے مرد کی واپسی کی فتنے کھائیاں اب بس ہوئی تھیں۔ دروازے پر لگی نگاہیں بند ہوئیں۔ اب وہ مارگریٹ نامی عورت صبح اٹھتی اپنی آنکھوں کی سرخی کو میک اپ کی تہ میں چھپاتی۔ پھر بھی بدہیت ہی لگتی۔ دو گھونٹ کافی پچکیوں کی مانند حلق سے اتار دی۔ جلتے کچے گوشت کی بو کی تہوں میں مدفون اداکارانہ مسکراہٹ کو نکالتی اور اسے اسکول کے لیے تیار کر کے اس کا ہاتھ پکڑ کے سڑک پر ایسے چلتی جیسے اپنا ہی تابوت اٹھائے اپنی قبر کی طرف جاری ہو۔

اپنی ماں کے زیر سایہ وہ بھی ایسے ہی چلا کرتا جیسے قبرستان جا رہا ہو۔ دو انسان خود کو تابوت میں لٹائے۔ خاموشی سے۔ طے شدگی سے۔ دو انسان اپنے ہی پیروں پر چل کر اپنی اپنی قبر کی طرف کیسے جایا کرتے ہیں۔ مارگریٹ اور اس کے بیٹے کو دیکھ کر جانا جاسکتا تھا۔

پھر وہ اسے اسکول سے گھراتی اسے ایک سینڈویچ

بنا کر دیتی گھر کو لاک کر کے چلی جاتی اور رات کو آتی۔ اس وقت تک وہ کھڑکی میں کھڑا اس کا انتظار کرتا رہتا۔ سینڈویچ ویسے کا ویسا ہی رکھا ہوتا۔ کھانا بھوک لگنے پر کھایا جاتا ہے اور اس کی بھوک مارگریٹ کی صورت دیکھتے ہی مرجاتی۔ وہ دعا کرتا نہیں جانتا تھا اس لیے صرف سوچا کرتا تھا کہ کاش اس کی ماں سے ایسی گندی بدبو نہ آیا کرے۔ کاش۔۔۔ وہ اس بو سے چھٹکارا پالے۔

اس کے باپ کی واپسی کے قصے جو وہ اسے سنایا کرتی تھی۔ اب بند ہو چکے تھے لیکن پرانی تصویروں کو دیکھنا اس نے بند نہیں کیا تھا وہ ایک تصویر کو جس میں وہ جھیل کے پانی میں پیر ڈبوئے بیٹھا تھا اور گردن موڑے مسکرا رہا تھا اور جھلک کرتی آنکھوں کو لیے عرب کا شہزادہ لگ رہا تھا اس کے چہرے کے ساتھ لگا کر دیکھا کرتی اور درپیکر دیکھا کرتی۔

"ہاں! تم میرے جیسے ہو" وہ خوش ہوتی اور گہرے سائوں میں گھر جاتی پتا نہیں وہ کس کس بات پر خوش ہو سکتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے وہ یہی سب کر کے کما کرتی۔ "دیکھو تو۔ تم تو بالکل اپنے پایا جیسے ہو۔" پھر وہ اپنی نم آنکھیں صاف کرتی۔ "تمہارے پاپا تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے، تم ان جیسے ہو میں خوش ہوں اس پر۔"

"ہاں! تم میرے جیسے ہو" کا عمل وہ ہر رات کیا کرتی جیسے اسے ہر دن یہ ڈر ہو کہ کہیں وہ اس تصویر جیسا تو نہیں ہو رہا۔ اس شخص جیسا ہی۔ اسے اپنی زندگی کا آخری مرد اپنی زندگی کے پہلے مرد جیسا نہیں چاہیے تھا اب۔

"تم مجھے چھوڑو تو نہیں جاؤ گے نا۔" وہ اس سے پوچھتی نہیں تھی بس بڑبڑاتی تھی اسے معلوم بھی نہیں تھا کہ چھوڑ جانا کسے کہتے ہیں۔ وہ ہاں کرتا ناں۔

جن دنوں اس کی طبیعت زیادہ خراب ہونے لگی تھی ان دنوں وہ رات رات بھر بڑبڑاتی رہتی، اس کی بڑبڑاہٹ عجیب ہوتی جیسے ہچکیاں لیتی ہو۔ مدفن

ہچکیاں۔

"اگر میرے بس میں ہو تو میں تمہاری دائیں آنکھ کی کمان کے کنارے پر بنے اس تل کو اپنی مٹھی میں لے لوں۔ اور اسے کہیں چھپا دوں۔ ہاں چلو اپنے دل میں۔ ماکہ جب تم ہنسو تو کوئی اور اس تل کے رقص پر فدا نہ ہو جائے۔ میں کسی اور کو تم پر فدا ہوتے نہیں دیکھ سکتی ہوں۔ میں مرجاؤں گی۔"

"کل میں فرش صاف کرتے پھسل گئی۔ میری ناک سے خون بننے لگا۔ میں رونے لگی، تم ہوتے تو اپنی آستین سے میرا خون صاف کرتے اور مجھے ہانپوں میں بھر کر کہتے "مارگریٹ دی سپر وومن۔ سپر وومن بھی روتی ہے کبھی۔ اور تمہاری نیلی آنکھوں میں ایک ہی چیز بھٹی نہیں لگتی "آنسو" تم وہ کام کیوں کرتی ہو مارگریٹ جو مجھے اچھے نہیں لگتے تم "آہ" کیوں کرتی ہو۔ اگر تمہیں کسی وجہ سے رونائی ہو اکرے تو تم خود کو کہیں چھپا لیا کرو۔ پھر اپنی روتی صورت کو میک اپ سے چھپا لیا کرو۔ مجھے معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم روتی رہی ہو۔"

"میں روتی رہی ہوں۔" مارگریٹ صبح تک یہی ایک فقرہ بڑبڑاتی رہتی۔ اس نے تھوک کر جلادی گئی محبت کی پوشاک میں خود سے ہی پیوند کاری کر لی تھی۔ وہ ایک ایسی جذامی بڑھیا بن گئی جس کے زخم ہی اس کی دوائ تھے۔ اسے کسی دید کے پاس جانے کی حاجت نہ تھی۔

کوئی ایسی محبت کو طوق زدہ زنجیر پا کرے جو گدھنی بوٹی بوٹی نوچتی ہے۔ ایسے مردار خوار کو کوئی رحم والا مردار کرے۔ کوئی رحم کرے۔

اور جب جب وہ بہت زیادہ بڑبڑانے لگتی اور اس کے کانوں میں مزید سکت نہ رہتی سننے کی تو وہ اپنے کانپے ہاتھ سے ہولے سے مارگریٹ کے جسم کو چھوتا اور وہ جھرجھری لے کر بڑبڑانا بند کر دیتی۔ اور ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے وجود میں سمیٹ لیتی۔ نہیں اپنے بیٹے کو نہیں۔ عرب کے گم ہو چکے اپنے شہزادے کو۔ جس کی محبت کو مار کر بھی وہ نہیں مار پار ہی تھی۔ اور جو







پندرہ سال کا ہو جانے کے بعد اسے وہ چیزیں دی گئیں جو اس کی ماں کی تھیں۔ جسے آنٹی سوسن نے سینٹر کے حوالے کیا تھا۔ اس نے وہ تصویر جسے وہ اس کے گال کے ساتھ لگا کر گھنٹوں دیکھا کرتی تھیں، سب سے پہلے پھاڑ کر پھینک دی۔ وہ خط جو غلط پتوں کی وجہ سے واپس آ چکے تھے، انہیں بھی وہ پھاڑ ڈالتا اگر وہ مارگریٹ کے ہاتھوں سے نہ لکھے گئے ہوتے۔ کچھ وہ خطوط بھی تھے جو مارگریٹ کی موت کے بعد واپس آئے تھے، یعنی اپنی موت سے پہلے بھی وہ اسے خط لکھتی رہی تھی۔ اس نے کبھی ان خطوط کو پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سوائے ایک بار کے۔

”آج سے چار سال پہلے جب تم اپنے گھر والوں سے ملنے کا کہہ کر مائچسٹر سے جا رہے تھے تو مجھے لگتا تھا میں تمہیں مائچسٹر میں آخری بار دیکھ رہی ہوں۔ یہ ایسا وہم تھا کہ بچن میں کام کرتے میں اپنا ہاتھ جلا بیٹھی۔ ڈاکٹر کے پاس میں تمہاری دی رنگ بھول بیٹھی۔ اس رنگ کو ڈاکٹر کے کوڑا دان میں بہت مشکل سے تلاش کر پائی۔ کوڑے دان میں اگلے دن اس رنگ کے ملنے نے مجھے اگل سا کر دیا تھا۔“

وہ فون کبھی نہ آیا۔ خط واپس آتے رہے۔ جس کی آنکھ کی کمان کے کنارے مل تھا اسے ڈھونڈنے مارگریٹ کا بے لگائی نکلتی رہی یہاں تک کہ زندگی کی آخری سانسیں لینے لگی۔ اور پھر موت نے اسے اپنی سانسیں عطا کر دیں، اپنے سارے وہموں کے ساتھ وہ پوشیدہ ہو گئی۔

وہ اس شخص کا جائز بیٹا تھا یا ناجائز۔ اسے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسکول میں اس کے نام کے آگے ولید البشر لگتا تھا جو بڑا ہونے پر اس نے بدل لیا۔ وہ کسی ولید البشر کو نہیں جانتا تھا۔ اگر دنیا میں کوئی ولید البشر تھا تو وہ اس کا باپ نہیں تھا۔ ایک بھیڑیا تھا جس نے اس کی ماں کو چیر پھاڑ ڈالا اور اسے لعنت قرار دیا۔ اس عورت کو اس نے لعنت قرار دیا، جس نے اس کے بعد دوستی کے نام پر بھی کسی مرد سے بات نہ کی۔ اگر وہ ایک لعنت ہی ہوتی تو پھول دار

کپڑے پہنے، خود کو سجائے بنائے اب تک زندہ ہوتی۔ وہ اب تک بڑی شان سے زندہ ہوتی۔ اس کے لحاف اس کے منہ سے نکلنے والے خون کے چھینٹوں سے سرخ نہ ہوئے ہوتے۔ اس کی راتیں سک کر نہ گزرتیں۔ اس کے دن آنکھوں کی نمی چھپاتے نہ گزرتے۔ اسے زندگی گزارنے کے لیے اقوال یاد نہ کرنے پڑتے۔ اور ہر روز اسے خود کو بہادر بنا کر زندگی کے سامنے نہ کھڑا کرنا پڑتا۔

وہ اسے لمبے لمبے خط نہ لکھتی۔ پاگل ہوئی اسے ڈھونڈتی نہ پھرتی۔

بے وفا اور لعنتی عورتیں اتنے وبال پالتی ہیں بھلا۔ اور کیا ایسی عورتیں اتنی جلدی مرجاتی ہیں۔ اور کیا اتنی ہی آسانی سے وہ موت کو خوش آمدید کہتی ہیں۔

پہلے وہ سوچا کرتا تھا کہ وہ اس شخص کو ڈھونڈ کر مار ڈالے گا۔ لیکن ماما مر کہا کرتی تھیں کہ اپنے دل و دماغ کو خاموش رکھو۔ سارے وبال یہیں سے پھوٹتے ہیں۔

ولید البشر کا خیال آتے ہی وہ اپنے دل و دماغ کو خاموش کروا دیتا۔ شروع شروع میں مشکل تھا۔ لیکن اس نے کر لیا۔ ماما مر ٹھیک کہتی تھیں اسے وبال پالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی زندگی میں مارگریٹ اور مہر موجود تھیں۔ اور اسے ان ہی کے سہارے زندگی مکمل کرنی تھی۔

\*\*\*

وہ خاص وقت تھا۔ بریلی ٹھنڈ میں مائچسٹر کی ایک ہندو گلی کے کنارے وہ خود کو دنیا سے چھپا کر کھڑا تھا۔ ”مارگریٹ اس کی ماں کا نام ہو گا تو باپ کا کیا ہو گا۔ معمولی وجہ نہیں ہے یہ۔ نہیں ہے معمولی۔ اس کے باپ کا خاندان کا کوئی اتا پتا نہیں ہے۔ وہ کون ہے وہ خود بھی نہیں جانتا ہو گا۔ یورپ کے آزاد معاشرے کی دین۔ غیر مذہبی۔ غیر اخلاقی اقدام کی پروان۔ میرے خاندان کے لیے طمانچے جیسے بائیں

ہوں گی یہ سب۔“

عالیان نے جھڑپ جھڑپ لی۔ اسے بہت ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ جس دیوار کے سارے وہ کھڑا تھا وہ گیلی تھی اور اس میں سے بو آتی تھی۔ نہیں وہ غلط تھا۔ وہ بو تو اس کے اندر سے آرہی تھی۔ انسانی گوشت کے جلنے کی۔

ہاں! اب اسے ٹھیک ٹھیک معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی نیلی و ہنسی ہوئی آنکھوں والی ماں نے کیا محسوس کیا تھا جب اس شخص نے جس سے وہ دیوانوں کی طرح محبت کرتی تھی اسے لعنت قرار دیا تھا۔

اچھا تو کیا اس کا سانس بھی ایسے حلق میں اڑکا ہو گا کہ سینے پر ہتھوڑے مارنے کو جی چاہتا ہو گا؟

زمین دھسان (دلہا) ہے۔ آکاش اندھیا رکاسیواک ہے۔ دھڑ۔ دھڑ۔ دھڑ۔ لاکھوں کروڑوں تاریکی غبار سے اپنے پٹ واہوئے۔ زندگی اندھیا رکی چاکر ہوئی۔ اور لورو خنیاں گل ہوئیں۔ اب بس گل ہوئیں۔

اس شخص کے دل کو تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے مارگریٹ کے بیٹے سے بھی بدلہ لیا تھا۔ اسے بھی چیر پھاڑ ڈالا تھا۔ اسی کی ذات کو لے کر اس پر سوال اٹھتے تھے۔ اس شخص کی شناخت سے اس کی شناخت ہونی تھی۔ جس شخص کے نام کو وہ اپنی زبان سے ادا نہیں کرتا تھا۔ اس شخص کے نام کو اپنے نام کے ساتھ لگانے پر اسے تسلیم کیا جائے گا۔ اگر ایسا ہی تھا تو اسے کچھ نہیں چاہیے تھا۔ اسے کوئی پہچان۔ کوئی محبت نہیں چاہیے۔ اسے امرت واجد اب نہیں چاہیے۔ اس کی ماں پر غیر اخلاقی اقدام کی انگلی اٹھانے والی۔

امرت واجد۔ درد کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی۔ آخر اس نے اس لڑکی کو کیوں پسند کیا۔ اس کی بد قسمتی اسے اس اسٹوڈنٹ پارٹی میں لے گئی۔ اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس فضول سے مذاق

میں شرکت کرنے کا جو فریڈر (سے آنے والوں) کے ساتھ کیے جاتے تھے۔ خاص کر امرت واجد کے ساتھ کیے جانے والے مذاق میں تو اسے بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ کیونکہ جب جب وہ لڑکی اسے ملی تھی اس کا مزاج ہی بگاڑا تھا اس نے۔

وہ ایک طرف اندھیرے میں کاک ٹیل لیے بیٹھ گیا اور سارا تماشائی بننے لگا۔ اور جب وہ رورو کرارہ میں چلانے لگی تو اسے برا لگا۔ اور جب گھنٹوں میں سر دے کر وہ باقاعدہ رونے لگی تو۔ تو۔

مارگریٹ بچن میں اس کے لیے کچھ پکانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اور کھڑکی سے اندر۔ بچن کی طرف سے آتی آوازیں سن رہا تھا۔ جب ان آوازوں کو سنتے سنتے وہ خود رونے جیسا ہو گیا تو بچن کی طرف آیا۔

”ماما!“ اس نے روتی ہوئی مارگریٹ کو بلانے کی جرات کی۔ کچھ دیر بعد وہ چھری پھینک کر اس کی طرف پلٹی۔ اس کی انگلی سے خون نکل رہا تھا۔

”میرا ہاتھ کٹ گیا ہے۔ مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔“

اگر وہ براڈوے میں کام کرتی تو سارے براڈوے کو لے ڈیتی۔ اتنے سے بچے کو الونیا نے میں وہ ناکام تھی، انگلی کاٹ کر رونے کی وجہ بتا رہی تھی۔

اس نے انگلی سے خون کو ہٹے دیا۔ اور روتی رہی، ”مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔ بہت درد۔“ اور وہ خاموش کھڑا انگلی کو نہیں ان آنکھوں کو دیکھ رہا تھا جن سے خون ابل رہا تھا اور وہ خون فرش پر نہیں اس کے دل پر گر رہا تھا۔

امرت واجد سک رہی تھی اور جب اس نے سیاہ مشرقی آنکھوں میں جھانکا تو اسے معلوم ہوا کہ مارگریٹ کی طرح لحاف میں منہ دے کر وہ بھی بہت روتی رہی ہیں۔ ان پر بھی کرب کے بہت سے پہاڑ ٹوٹے ہیں۔ وہ ان آنکھوں میں جکڑا گیا۔

مارگریٹ کو پھر سے کسی نے رلا دیا۔ اب وہ یہ نہیں ہونے دے گا۔



وہ رات اس نے جاگ کر گزاری۔ مشرقی افق پر  
دو نین دھڑے تھے وہ ان میں ڈوب ڈوب جاتا تھا۔  
بھوری آنکھوں میں جو دھوپ بچے پڑے تھے وہ جل  
ٹھٹھے تھے۔

وہ تان سین کی شاگرد رہی ہوگی۔ اس نے اس  
کے اندر چرچا اٹھایا تھا۔  
وہ حیات کا دہانہ تھی۔ وہ اسے زندہ کر رہی تھی۔  
وہ مشرقی ساحل تھی۔ بس میں کر لیا وہ سیکھ چکی  
تھی۔

اور وہ ہنسنے لگی تھی وہ اس کے زخم مندمل کرنے  
آئی تھی۔ اسے لڑکیوں میں اتنی دلچسپی تھی جس سے  
کارل کو چڑھ سکے وہ کارل کی ہر گرل فرینڈ کو لے اڑتا۔  
کارل کے ساتھ یہ سب چلتا رہتا تھا۔ پھر اس نے ایک  
ایسی لڑکی میں دلچسپی کیوں لی جس نے اتنی حقارت سے  
وہی سارے الفاظ اس کے منہ پر دے مارے تھے جو  
کبھی ڈنمارک میں اس کی ماں کے منہ پر مارے گئے  
تھے۔ وہ خود اپنے باپ کے لیے بھی اتنا ہی حقیر تھا۔  
جتنا اب امرجہ واجد کے لیے۔

اس نے استہزائیہ ہنس کر سوچا۔ ”ایک ہی نسل  
کے دو انسانوں کا ایک جیسا نصیب۔ دونوں کو محبت  
ہوئی۔ دونوں کو بدلے میں دھتکار ملی۔ دونوں کو  
لعنت قرار دے دیا گیا۔“

دو انسانوں کے نصیب میں اتنی مماثلت۔ وہ  
واقعی بہت بد نصیب تھا۔ اس کا ٹوٹ کر رہنا تھا۔  
امرجہ واجد کو اس کی ماں سے زیادہ اس کے باپ کی  
فکر تھی جس کی غلیظ تصویر کو اس نے پھاڑ کر پھینک  
دیا تھا۔ وہ انگلی اٹھا رہی تھی کہ وہ کون تھا۔ وہ عالیاں  
مار گریٹ تھا۔ اور اسے کیا ہونا چاہیے تھا۔ اگر  
عالیاں نام اسے اس کی ماں نے نہ دیا ہوتا تو وہ یہ بھی  
بدل لیتا۔

اسٹوڈنٹ پارٹی کے بعد اس نے خود کو اسے دیکھتے  
پایا۔ وہ اس کے ڈیڑھ ٹائم تک جاتا۔ وہ اپنے لیے  
دوڑے کو سنبھالتی یونیورسٹی کے درو دیوار کو ایسے دیکھتی  
جیسے کسی نئے جہان آپکی ہو۔ وہ اپنے آپ میں

سکراتی رہتی۔ خاص کر تب جب اس کے قریب  
سے کوئی عجیب و غریب لباس یا ہینو اسٹائل والا  
اسٹوڈنٹ گزرنا اسٹوڈنٹ پارٹی کے بعد اس نے دیکھا  
کہ ہنسی کو دبائے، زبردستی کا منہ پھلائے وہ سب کی  
معذرت سن رہی ہے جیسے ان پر اس نے ”سٹو“ کر دیا  
تھا لیکن یہ اس کی انسان دوستی کی مثال ہے کہ وہ ایسا  
نہیں کر رہی، ڈیرک جیسے ہاتھ باندھے سزا کے انتظار  
میں کھڑا تھا اور وہ اعصاب مانے کسی خونخوار بادشاہ کی  
اکھوتی بیٹی کی ایسے ظاہر کر رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔  
”بس۔۔۔ اب تمہیں بھوکے پیروں کے آگے  
ضرور ڈالا جائے گا۔“

وہ اکثر آکسفورڈ روڈ پر اس کے پیچھے جاتا۔ اس کا  
دوپٹہ اس کے لیے ایک مسئلہ تھا۔ اسے اتنے بڑے  
بڑے دوپٹے لینے کا شوق بھی تھا اور انہیں سنبھالنا بھی  
نہیں آتا تھا۔ شاید وہ سارے ماچسٹر کو یہ بتانا چاہتی  
تھی کہ صرف وہ اکیلی ہے ”مشرق کی پہچان“ کی ہاں۔  
وہ اکیلی۔

ایک دن جب وہ آکسفورڈ روڈ پر اس کے پیچھے پیچھے  
آیا تو اس کا دوپٹا اس کے پیچھے والے کے پاؤں میں الجھ  
گیا۔ پیچھے والا معذرت کر کے آگے بڑھ گیا۔ اور وہ  
دوپٹے کے کنارے اور اس کنارے کو پیر تلے دبائے  
والے کو گھورتی رہی۔ کچھ آگے جا کر اتفاقاً وہ بے  
چارہ الجھ کر گر گیا۔ اور وہ جو پیچھے کھڑی اسے گھور رہی  
”ہنسی“ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا  
جیسے اس لڑکے کو کہہ رہی ہو۔

”اب آیا مزہ۔ اگلی بار دھیان سے چلنا۔۔۔ یو  
ایڈیٹ۔“

اور اسی دوپٹے کو لے کر اگلا منظر کچھ یوں تھا کہ ایک  
ہندوستانی لڑکے نے زمین بوس ہوتے اس کے دوپٹے  
کو پیچھے سے اٹھا کر اسے دیا اور ساتھ کوئی استہزائیہ یا  
طنزینہ جملہ کہا اور ہنسنے لگا۔ اور پھر ایک دم سے اس کی  
ہنسی ختم ہو گئی۔ امرجہ واجد ہاتھ لہرا لہرا کر اسے کچھ کہہ  
رہی تھی۔

”ہندوستان، پاکستان کی تاریخی ناجاتی کا ایک چھوٹا

سامنظر۔“

بات شاید دوپٹے سے ہوتی، اسلام اور دہلی تک جا  
پہنچی تھی۔

اور اس سے اگلا منظر کچھ ایسے تھا کہ یونی کے باغ  
میں لگے ایک۔۔۔ پودے کے ساتھ اس کا دوپٹہ انک  
گیا وہ ذرا آگے چلی گئی، دوپٹے کے کھنچاؤ سے اسے  
پیچھے پلٹنا پڑا اور ایسا کرتے وہ اپنے پیچھے آنے والی لڑکی  
سے ٹکرائی۔ ٹکرائے اس پجاری کی عینک گرتے ہی  
ٹوٹ گئی جو اس نے کچھ دیر کے لیے سر پر لگائی ہوگی۔  
ظاہر ہے وہ بے چاری صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئی، اگر  
امرجہ واجد ہوتی تو دھڑائیں مار مار کر روئی۔ اسٹوڈنٹس  
کی ہمہ وقت کی خالی جیبوں پر ایسے نقصانات کسی  
ہائیڈروجن بم کی طرح پھٹتے ہیں اور وہ تو پھر اس کا نظر کا  
چشمہ تھا کتابوں سے زیادہ اہم و ضروری۔ عالیاں کو  
اس سے بات کرنے سے زیادہ اس کے پیچھے پیچھے رہنا  
دلچسپ اور حیرت انگیز لگتا تھا۔

ایک دن اس کے کلاس فیلوز نے اسے پروفیسر ڈرل  
کے آفس بھیج دیا۔ پروفیسر ڈرل صرف what ہی  
ایسے پوچھا کرتے جیسے کہہ رہے ہوں۔  
”کیا۔۔۔ یعنی کہ کیا۔۔۔ ہیں۔ کیا؟ اب بولونا۔  
بولتے نہیں۔“

ایسے what کو سن کر سامنے پیش ہونے والا کتنا  
ہی ضروری کام کو لے کر آیا ہوتا ہی سوچتا کہ ”آخر کیا  
ضرورت تھی اتنے معمولی سے کام کے لیے پروفیسر کو  
تنگ کرنے کی۔“

وہ دونوں ہاتھوں کو میز پر رکھتے اور مرتبہ پر جانے  
جیسی سنجیدگی لیے ایسے دیکھتے جیسے کہتے ہوں۔

”تمہاری یہ جرات کہ تم یہاں تک آئے۔ لاؤ  
دکھاؤ کیا مسئلہ ہے۔ آئے ہیں بڑے پڑھنے۔ نیوٹن  
بنے۔ باتوں سے فرصت نہیں اور آجاتے ہیں۔  
پروفیسرز کو تنگ کرتے ہیں۔“

اور پھر وہ اس پیش ہونے والے نیوٹن سے وہ وہ  
سوال کرتے کہ اس بے چارے بے چاری کو رندھے  
گلے کے ساتھ معذرت کر کے اٹھنا پڑتا۔

”مالا لال! اپنی پشت پر یہ سرگوشی بھی سننا پڑتی۔  
رندھے گلے کے ساتھ اور مالا لال کا لقب لے کر  
جب وہ پروفیسر ڈرل کے آفس سے باہر آئی تو اسے بھیجے  
والے اس کے کلاس فیلوز کو ریڈور میں لوٹ پوٹ  
ہونے لگے۔ انہوں نے نجانے کون کون سے جھوٹ  
بج گھر کر اسے بھیجا ہو گا اور یہ بات اسے آفس سے باہر  
آنے کے بعد معلوم ہو گئی تھی۔ وہ خاموش کھڑی ان  
کے قہقہے سنتی رہی۔ پھر خود بھی ہنسنے لگی۔ اس بار اس  
نے ہاتھ میں پکڑی فائل انہیں دے مارنے کی حرکت  
نہیں کی تھی۔

وہ ماچسٹر کے رنگ میں رنگ رہی تھی۔ پہلے کی  
نسبت وہ خوش نظر آ رہی تھی۔ عالیاں کو لگنے لگا تھا کہ  
وہ کسی وینڈر لینڈ میں آگیا ہے۔ یعنی صرف ایک لڑکی  
کے ماچسٹر میں آجانے سے سارا ماچسٹر ہی وینڈر لینڈ میں  
بدل چکا تھا۔ وہ اب تک اپنی ماں کو یاد کر کے سو رہا تھا۔  
اور کئی کروٹیں بدلنے کے بعد اسے نیند آتی تھی۔  
اب وہ اسے سوچتا۔ مسکراتا۔ اور سو بھی جاتا۔ اور  
کبھی سوچتے سوچتے لحاف کو جھٹک کر اٹھ کر بیٹھ جاتا  
اور قہقہے لگاتا۔ اچھا تو وہ بھی پری تھی۔ جس کی کہانی  
کیس سے بھی شروع ہو اختتام پا رہا ہے۔  
وہ اپنی کلاس فیلوز سے پوچھنے لگا۔

”Rotatouille دیکھی ہے۔ وہی چوہے والی  
۔۔۔؟“

”ہاں۔ کون سی؟“  
”جس میں چوہا کھانا پکاتا ہے۔“

”اچھا۔۔۔ سو سوٹ۔ وقت ملتے ہی ضرور دیکھوں  
گی۔“

”ہاں! وہ کتنا کیوٹ لگتا ہے نا وہ کھانا پکاتے۔ لو  
اٹ۔“

کوئی بھی اس کی طرح آخ نہ کرتا۔ ناک نہ چڑھاتا  
۔۔۔ ہاں ٹھیک تھا۔ ٹھیک تھا کہ وہ مشرق سے آیا بھید  
تھا۔ جسے وہ کھول رہا تھا۔ ان کا ایک انگریز دوست  
کسی انوکھی بات پر اکثر ہلا کر بوڑھے جرنیلوں کی طرح  
تاسف سے کہا کرتا۔



”تم نے مشرق کے گھاٹ کا پانی پی لیا ہے۔ تمہاری سمجھ اب سمجھ سے بالاتر ہو چکی ہے۔“  
 امرجہ سے ملنے کے بعد اب اسے لاہور جانا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا وہاں سب اس جیسے ہیں۔ کیا سب لڑکیاں ایسے ہی دوپٹوں میں الجھتی ہیں۔ بری بات پر ناک چڑھا کر ”آخ“ کرتی ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر آنکھیں نم کر لیتی ہیں۔

جب وہ فارغ ہو تا وہ ”لاہور نامہ“ پڑھتا رہتا۔ یعنی اپنے فارغ اوقات کار میں وہ ”لاہور“ میں رہتا۔ وہ اتنا لاہور میں رہنے لگا کہ صبح آنکھ کھلتے ہی اسے خود کو یاد کروانا پڑتا کہ وہ St-Anselm Hall میں ہے کینٹ یا مال میں نہیں۔ وہ روزپاکستانی اخبار بھی ضرور پڑھتا کہ لاہور میں کیا کیا ہو رہا ہے۔ لاہور میں کچھ بدل تو نہیں گیا۔ اس نے لوڈ شیڈنگ کے بارے میں اتنا پڑھا کہ اس نے امرجہ سے پوچھ ہی لیا۔

”کیا واقعی پاکستان بجلی کو لے کر اتنے بڑے کرائسنز سے گزر رہا ہے۔“  
 اس کا رنگ فق سا ہو گیا۔ ”نہیں۔۔۔ پر تم کیوں پوچھ رہے ہو۔۔۔؟“

”نہیں۔“ وہ اس کے نہیں پردنگ تھا۔ ہر روز وہ بجلی کو لے کر خبریں پڑھتا تھا۔  
 ”ایسے ہی۔۔۔ وہ میرا ہاسٹل فیلو تیار رہا تھا۔“ اس نے بہانا بنایا۔

”کیا تیار رہا تھا۔۔۔ کوئی پاکستانی ہے یا ہندوستانی۔“  
 اس نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔

عالیان کے لیے یہ حیران کن منظر تھا۔ ”یہی کہ وہاں بجلی کا مسئلہ۔“

”وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے بجلی کا۔۔۔ سب ٹھیک ہے۔۔۔ جیسے یہاں سب ٹھیک ہے۔۔۔ کیوں ہو گا وہاں کوئی مسئلہ؟“ اسے یقیناً اس ہوسٹل فیلو پر غصہ آ رہا تھا۔ عالیان دنگ اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اپنے ملک کی عزت کو لے کر وہ اتنی حساس تھی کہ ایک غیر ملکی کے سامنے کسی بھی اندرونی مسئلے کو لے کر بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی، یعنی یہ ان کے گھر کا معاملہ تھا، غیر ملکی

دور رہے اس سے۔

”میں نے خبریں سنی ہیں بی بی سی پر۔ احتجاج دیکھتے ہیں۔“

”کبھی کبھار بجلی کا چھوٹا بڑا مسئلہ ہو جاتا ہے تو بس تھوڑے سے لوگ احتجاج کر لیتے ہیں۔ بس ایسے ہی۔“  
 امرجہ ایک باکمال پاکستانی تھی، سات سالوں کی خون کے آنسو لانے والی لوڈ شیڈنگ کو وہ چھوٹا بڑا بھی کبھار کا مسئلہ کہہ رہی تھی۔

”کبھی کبھار کے مسئلے ر لوگ ایسے احتجاج کرتے ہیں۔ انہوں نے حکومتی آفس کو آگ لگا دی تھی۔“  
 ”تم نے کوئی غلط خبر دیکھی ہے۔ ایسا نہیں ہو گا۔ آگ کیوں لگائے گا بھلا کوئی۔۔۔ سب ٹھیک رہتا ہے لاہور میں۔ پاکستان میں۔۔۔ بہت پیارا ملک ہے ہمارا۔ ہمیں وہاں کوئی مسئلہ کوئی مشکل نہیں ہے۔“

ہاں یقیناً ”بہت پیارا ملک ہو گا۔ جس ملک کی رہنے والی اس کی کسی خامی کو زیر بحث نہیں لارہی“ جس کے خلاف وہ ایک بات نہیں سننا چاہتی، وہ ملک کتنا پیارا ہو گا۔ وہ امرجہ سے زیادہ پیارا ہو گا۔

عالیان کو اس کی یہ حساسیت اتنی آچھی لگی کہ اس نے پاکستان کو لے کر وہ خبریں ہی پڑھنی بند کر دیں جن میں کسی مسئلے کی نشاندہی ہوتی۔ لاہور میں سب ٹھیک ہے۔۔۔ جیسے ماچسٹر میں سب ٹھیک ہے۔

تو امرجہ کا لاہور اس کا ہو گیا تھا۔ جیسے عالیان کا ماچسٹر امرجہ کا ہو چکا تھا۔ ایسے ہی فاصلے کم ہو جاتے ہیں۔

محبت ہی میں ہم اپنی ساری قیمتی چیزیں ہتھیلی پر رکھ کر پیش کر دیتے ہیں کہ لو یہ آج سے تمہاری ہو میں۔

کارل سے امرجہ کو چھپائے رکھنا کسی مہم کو سر کرنے کے برابر تھا۔ بظاہر کارل ایسے ظاہر کیا کرتا جیسے وہ بالکل انجان ہے اور اس کے پاس تو اتنا وقت ہے ہی نہیں کہ عالیان کی نگرانی میں ضائع کرتا پھرے۔ لیکن حقیقت میں وہ ان لوگوں میں سے تھا جو چوبیس گھنٹے کو چوبیس دن بنا لیتے ہیں۔

ایک رات جب دونوں سڑک پر شرط لگا کر دوڑ رہے تھے اور کارل جیت چکا تھا تو اس نے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہا۔

”تم آج کل مسلسل مجھ سے ہار رہے ہو۔“  
 ”ایک دوڑ میں ہر اکرم مجھے لوڑ نہیں کہہ سکتے۔“  
 وہ ہنسا ”ایک دوڑ میں۔ کم آن عالیان۔ اس ہفتے میں یہ تیسری بار ہے۔“

”میری صحت کچھ خراب ہو گئی ہے۔ میں فٹ نہیں ہوں۔“

وہ اور ہنسا ”تم ہار رہے ہو۔ مطلب تم کہیں اور جیت رہے ہو۔ مجھ سے ہار کو تم اہمیت نہیں دیتے۔ میرے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے۔ میں نے تم سے کہا کہ مارٹن کو اسٹور روم میں لا کر تھامے تو تم نے کہا کہ وہ بے چارہ ڈر جائے گا۔ اس سے پہلے تو تمہیں کبھی کسی کے ڈرنے کی پروا نہیں ہوئی تھی۔“

”اگر وہ انتظامیہ سے ہماری شکایت کر دیتا۔۔۔؟“  
 کارل منہ کھولے اسے دیکھتا رہا۔ ”اس سے پہلے ہم ڈیوڈ کے ساتھ یہ کر چکے ہیں اور اسے تو ہم نے کوڑے دان میں کیا تھا۔ اور بے چارہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ تم اب بدل رہے ہو۔ میں تمہیں اکیلا بدلنے نہیں دوں گا۔“ گھونسا دکھا کر کہا۔

”میں اب بڑا ہو رہا ہوں۔“

”نہیں۔ بڑے ہونے کی نشانیاں نہیں ہیں یہ۔۔۔ مجھے تشویش ہے۔ بلکہ خوف ہے میں اپنا بہترین دشمن کھودوں گا۔ یونو! سرکارل کہتے ہیں دوست ہونہ ہو دشمن ضرور ہو اور تم جانتے ہو پوری یونیورسٹی میں میری فکر کے صرف تم ہو۔“ کارل نے انگلی اٹھا کر کہا۔

”تم انتظار کر لو۔ فریئرز میں بہت سے چھینے تمہاری فکر کے آچکے ہوں گے۔ جتنی چاہے فکریں انہیں مار لیتا۔“

”میرا خیال ہے وہ بل آچکا ہے۔“ سرکارل نے پرجوش سر ملایا۔

عالیان زیر لب ہنسا۔ ”امرجہ۔ بل۔ ہا ہا۔“

امرجہ کے نام پر ہی وہ ایسے مسکرایا کرتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ برقیے کیسے نہیں مسکرایا کرے گا۔ ہر بار ایک نئی مسکراہٹ۔ اک نئی ادا۔

پرانی امرجہ کی جگہ ایک نئی امرجہ۔ نئی امرجہ کی جگہ نئی پھر سے پرانی امرجہ۔

\*\*\*

رات کے آخری پہرہ اپنے کمرے میں آیا۔ کمرے میں کارل موجود تھا اسے کمرے میں آنے کے لیے۔ کسی کے بھی کمرے میں جانے کے لیے چابی کی ضرورت نہیں پڑا کرتی تھی۔ جس حساب سے وہ جاسوسی، ایکشن فلمیں دیکھتا اور ٹائل پڑھتا تھا اب تک جیمز بانڈ نہیں بن چکا تھا تو یہ اس کی کسر نفسی تھی۔

”میرے کمرے سے جاؤ کارل!“ اس نے اپنا بورچا کوٹ اتار کر پھینکا۔

”تم کہاں تھے؟“  
 ”تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“  
 ”تمہارا شکریہ میں ادا کر چکا ہوں۔ اب تم جاؤ۔“

”شکریہ۔۔۔ یہ لفظ پہلے کب ہم دونوں نے استعمال کیا ہے؟ ذرا بتاؤ۔۔۔ وہ لڑکی تمہیں پسند نہیں کرتی۔ بات ختم۔“

”ہاں بات ختم۔ اب جاؤ۔“

”نہیں۔ تم ٹھیک سے بات ختم کرو۔“ کارل نے اس کی شرٹ کا گریبان پکڑ لیا۔

”میں بات ختم کر چکا ہوں کارل۔ تم سے بھی اور اس سے بھی۔“ اس نے اپنا گریبان آزاد کروایا۔

”اس سے کرنا تو بنتا ہے۔ اس نے تمہاری بے عزتی کی۔ لیکن تم؟“

”میں سب سے ختم کر رہا ہوں۔“ وہ چلایا۔

”کتنی لڑکیوں کے ساتھ تم نے میرے بریک اپ کروائے۔ میں نے کبھی ایسے ری ایکٹ نہیں کیا۔

چند ایک کے ساتھ تو میں سنجیدہ تھا۔ تم بہت برے



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رٹریوم ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو یو
- ☆ ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریٹنج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، ہارمل کوالٹی، کمپیوٹر کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریٹنج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شریک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➔ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک ویکر متعارف کرائیں

**WWW.PAKSOCIETY.COM**

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کھلاڑی بنتے جا رہے ہیں۔  
ہاں! میں بہت برا کھلاڑی ہوں۔ بدترین انسان ہوں میں۔ اس نے کارل کو ہلکا سا دھکا دے کر خود سے دور کیا۔ تم جاؤ اب۔  
تم یہ سب نہیں کر سکتے۔ ایسے خود کو نہیں بدل سکتے۔ کارل چلایا۔ ہم دونوں نے بہت وقت ساتھ گزارا ہے۔ میرا حق ہے تم پر۔  
عالیان نے اپنے منہ کو اس سے چھپانے کی کوشش کی۔

جاؤ کارل۔ خدا کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔  
کئی لمحے اسے دیکھتا رہا پھر وہ چلا گیا۔

\*\*\*

عالیان St-Anselm Hall کے کمرے کی کھڑکی سے برف پر گرتے اندھیرے کو دیکھنے لگا۔ ایک گھر جو اسے کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایک گھر۔ ایک خاندان۔ کارل اور وہ چپکے چپکے اس کے خواب دیکھتے رہے تھے۔ ایک دوسرے کو وہ یہی بتاتے کہ انہیں بزنس ٹائیکون بننا ہے۔ اور ایک دوسرے سے چھپا کر وہ ہوم ڈیکور کے رسالے دیکھتے رہتے۔ کارل جو اتنی لڑکیاں بدل چکا تھا، صرف اس لیے کہ وہ جان چکا تھا کہ وہ گھر نہیں بنا سکتیں اور جب ان لڑکیوں سے اس کا چھٹکارہ حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا تو جیسے وہ خود عالیان کو دعوت دیتا کہ خدا کے لیے میرا بریک اپ کروادو۔

ایک گھر۔ ایک خاندان۔ مل کر ایک ہو جانا۔ اس کی اہمیت وہی سمجھ سکتا ہے جو ان سے محروم رہا ہو۔ عالیان نے تو پھر بھی چند سال اپنی ماں کے ساتھ گزارے تھے کارل نے تو ہوش ہی کنڈر سینٹر میں سنبھالا تھا۔ اس کے والدین ٹرین کے حادثے میں مر چکے تھے سو تیلے نانا اور نانی نے اسے اس کنڈر سینٹر کے حوالے کر دیا تھا۔

ایک بار اس نے امرجہ سے پوچھا۔  
تمہارے وہاں گھر کیسے بنتے ہیں؟

”مطلب تعمیرات؟“  
”نہیں۔ مطلب کیا خواہش رکھی جاتی ہے ایک گھر کو لے کر کہ وہ ایسا ہو؟“  
”اچھا یہ۔ اگر کوئی اللہ دین کا چر اغ پوچھ رہا ہے کہ گھر کیسا ہو تو سعودی شہزادے طلال کے محل جیسا یا پام شٹی میں میڈونا کے گھر جیسا۔“  
وہ ہنسا۔ ”اللہ دین نہیں ایک عام انسان پوچھ رہا ہے۔ مجھے جیسا عام۔“  
”اچھا!“ اس کا منہ ٹٹک گیا۔ اللہ دین کا خواب چکنا چور ہوا۔ اب اسے شہزادے طلال جیسا محل کون بنا کر دے گا۔ عالیان زیر لب ہنسا۔

”اگر میں بزنس ٹائیکون بن گیا تو اسے ایک محل بنا دوں گا۔ اور میں نے اپنے پیسے کا کرنا ہی کیا ہے لیکن اگر میں اس کے لیے اللہ دین نہ بن سکا تو؟“  
”ایک بڑا سا باغ ہو جس میں کئی سو پھول کھلے ہوں۔ اس باغ میں گھر کی بڑی بڑی کھڑکیاں کھلتی ہوں۔ پیچھے بھی کئی سو پھولوں والا ایک باغ ہو ایک چھوٹی سی آبشار کے ساتھ اور اس میں بھی بڑی بڑی کھڑکیاں کھلتی ہوں گھر کی۔ یہ ماسٹر بیڈ روم ہو اور لائبریری۔ گھر کی چھت بہت اونچی ہوئی چاہیے۔ یعنی اتنی کہ چھ فٹ لسا فانوس لگا ہو تو سر اٹھا کر دیکھنے پر وہ دور۔ بہت دور لگے۔“

”یہ ایک عام آدمی کا گھر ہی ہے نا مرحہ! ۴۱ سے ٹوکنا پڑا۔“

وہ رک کر سوچنے لگی اور خاموش ہو گئی۔ یعنی خفا ہو گئی۔ مطلب ایک سیدھا سا جواب اس سے حاصل کرنا مشکل تھا۔ کہیں وہ اتنی ذہین تھی کہ فوراً ”جواب گھڑیتی تھی۔“

”نہیں کوئی ایٹو نہیں ہے میس کا۔ کس نے کہا۔ موبائل چھین لیے جاتے ہیں جھوٹ۔ یہ مغربی اخبارات نا۔ یہاں تو تم لوگ انگلی اٹھاتے ڈرتے ہو نا کہ پولیس کو نہ بلوالے، ہم لوگ وہاں سیدھا سیدھا تھپڑ مار دیتے ہیں۔ تھپڑ اور کوئی پولیس نہیں آتی۔“ اور کچھ معاملات میں وہ ایسی تھی جیسے اونٹے بونٹے



لوگ ہوا کرتے ہیں اور انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ کس قدر بونے ہیں اور ہاں یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ان کا یہ بونگاپن کسی کو بہت اچھا لگتا ہے اتنا کہ اپنے چہ سات ہوٹل میٹس کے ساتھ گپیں ہانکتے سڑک پر چل قدمی کرتے۔ اپنے بیڈ کی چادروں کو یونانی طرز پر جسم پر باندھے ایک کندھا عریاں رکھے۔ یونانی ہی تیز میوزک پر کوریڈور میں ٹھکے لگاتے اور اپنے دیگر بندر لنگور کے کرتب کرتے کوئی اسے ہی سوچتے اسی کے لیے زیر لب ہنستا ہے۔ کوئی ٹھنڈی راتوں میں لحاف پھینک کر اٹھ بیٹھتا ہے وہ خود کو تلاش کرتا ہے۔

عالیان۔ ہاں عالیان۔ کہاں گیا وہ بے چارہ۔ ساتھ کے کمروں میں جب کوئی پاجامہ پارٹی 'or Die Do (کرو یا مرو) یا اسٹوڈنٹس Opera چل رہا ہوتا تو وہ اپنے کمرے میں بیٹھا کسی اور کو محسوس کر رہا ہوتا۔ کارل اسے گھسیٹ کر لے جانے کی کوششیں کرتا۔

”تم میاؤں میاؤں ملی بنتے جا رہے ہو۔ چلو شیر بنو اور ذرا دھاڑ کر دکھاؤ۔“ وہی فارغ اوقات میں کی جانے والی ان کی کبھی ایکشن، کبھی مسٹری، کبھی ہارر اور کبھی مزاحیہ موویز جیسی حرکتیں اور شرارتیں لیکن اب اس سب میں اس کا خاص دل نہیں لگتا تھا۔ وہ کر تویٹا تھا لیکن بس خود کو برانا والا عالیان ثابت کرنے کے لیے۔ اسے ڈر لگتا تھا کہ کوئی اس کے دل کا بھید نہ پا جائے۔

بھید جو بھوری آنکھوں نے کالی آنکھوں سے کشید کیا تھا۔ بھید جو محبت میں ملفوف دل پر کھلتا ہے۔ صرف محبت میں ملفوف دل پر۔

اسے یہ چونکا سا دینے والی لڑکی اس قدر اچھی لگی کہ اس کی کوئی بات اسے بری نہیں لگتی۔ اس کی کسی بات پر اسے غصہ نہیں آتا۔ اس کی کسی بات پر وہ بھڑکتا نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے وہ پری بھی جو دودھوں والے بندر سے خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ سارا ماچسٹری اس

کے لیے دودھوں والا بندر تھا۔ وہ حیران ہو ہو کر ڈر ڈر جاتی۔ اس کا خیال تھا دنیا میں سب سے اہم محبت ہوتی ہے۔ امرجہ نے اسے سمجھا دیا تھا کہ اور کیا کیا کچھ اہم ہوتا ہے۔

عالیان کھڑکی میں کھڑا تھا اور آج پہلی بار امرجہ کے بارے میں سوچتے ہوئے زیر لب مسکرا رہا تھا۔ اسے رات گزرنے کا غم نہیں تھا کہ اگر رات گزر گئی تو وہ کس وقت امرجہ کو سوچے گا۔

باہر فروری برف کی صورت برس رہا تھا۔ فروری جسے جدید دنیا نے سرخ۔ سرخ۔ سرخ۔ رنگ ڈالا ہے یہ فروری آج اس سرخ۔ پر سفیدے کی صورت گرے اس کا گلابا رہا تھا۔

بیر کو وہ یونیورسٹی آئی تو جو پہلا شخص اس کے پاس آیا وہ کارل تھا۔ چمڑے کی جیکٹ میں دونوں ہاتھ ڈالے، ہناٹوں پر اور منظر کے وہ بہت غصے سے اسے گھور رہا تھا۔

”تم یونیورسٹی سے خود جاؤ گی یا میں تمہیں نکلواؤں؟“ یہ بات کہتے وہ انتہا کا سنجیدہ تھا۔ وہ جواب دیے بغیر آگے بڑھی ہی تھی کہ اس کے کراس بیگ کے اسٹریپ میں اس نے پین کو اڑس کر اسے بری طرح سے پیچھے کھینچا۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ۔“ وہ ابھی بھی خاموشی سے اسے گھور رہا تھا۔ ”میں تمہاری شکایت کر دوں گی۔“ وہ دن میں یونیورسٹی سے باہر ہو گئے۔

”تمہیں دو سیکنڈ بھی نہیں لگیں گے دنیا سے باہر ہونے میں۔ اگر عالیان واپس نہ آیا تو۔“ امرجہ نے چونک کر کارل کو غور سے دیکھا۔ ”کیا مطلب۔؟“

”میں نے کہا اگر عالیان واپس نہ آیا تو۔“ خنقی سے وہ اسے دھمکا رہا تھا۔ ”عالیان کہاں ہے؟“

”تم بتاؤ۔ عالیان کہاں ہے؟“ اناس نے پوچھا۔ اس انداز میں پوچھا کہ امرجہ ڈر گئی۔

”تم خود کو سمجھتی کیا ہو۔ عالیان کے مقابلے میں تم ہو کیا۔ تم جیسی لڑکی جو ایک ڈگری لیٹا ہوا سر کرنے کے برابر سمجھتی ہے وہ آخر خود کو سمجھتی کیا ہے۔ کس دنیا سے آئی ہو تم جانتی ہو نا۔ یا میں تمہیں یاد دلاؤں کہ تمہاری حقیقت کیا ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟“ امرجہ بری طرح سے ڈر گئی۔

”کہنا نہیں بتانا۔ عالیان کا کوئی خاندان نہیں ہے۔ وہ ایک ناجائز بچہ ہے اور وہ تمہاری طرح اچھا مسلمان نہیں ہے۔ ایک تم ہی ہو اچھی والی مسلم نہ۔ اس کی ماں ایک بری عورت تھی اور باپ۔ ہونہ۔“

امرجہ یکدم سانس لیٹا بھول گئی۔ یونیورسٹی کی محراب موم بتی کی لوکی طرح تھر تھرانے لگی۔ ”یہ سب تمہیں کس نے بتایا؟“ امرجہ کی جان مٹھی میں آگئی۔

”بتایا۔ ہونہ۔ میں نے خود سنا ہے۔ ان فیکٹ آف یونیورسٹی نے سنا ہے۔ وہ سب جو تمہاری سوچ ہے۔ جو حقیقت میں تم ہو۔ ویسے تم لوگ بہت بڑھے لکھے بنتے ہو۔ ماچسٹری جیسی یونیورسٹی میں پڑھنے آتے ہو۔ خود کو تعلیم یافتہ کہلاتے ہو اور اندر سے وہی گھسی پٹی گھنٹیا سوچ رکھتے ہو جاہل لوگ۔ ہونہ۔“

”مجھے بتاؤ کارل! تم کس سننے کی بات کر رہے ہو۔“ تھر تھراتی محراب گرنے کو تھی۔ وہ گر جائے گی۔ نظر آ رہا تھا وہ گر جائے گی۔

”جو تم نے عالیان کے لیے ویرا سے کہا وہ سب ریکارڈنگ ہے میرے پاس۔ سنو گی۔“

محراب دھڑام سے زمین بوس ہوئی۔ افسوس۔ اس محراب کے عین نیچے ہی امرجہ کھڑی تھی۔ امرجہ کو پر شور جھکڑنے آلیا۔ اس کی نظر دھندلا گئی۔ اسے کارل ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہیں۔ اسے تو دنیا میں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بس اتنی سی دیر لگتی ہے اندھا ہونے میں۔ اتنی سی دیر میں روخنیاں گل ہو جاتی ہیں۔ ”وہ سب کیا؟“ وہ بخشش پوچھ سکی۔

”جو جو تم نے ویرا سے کہا تھا وہ سب۔ امرجہ۔ دی مینڈکی۔ اب عالیان کو ڈھونڈ کر تم لاؤ گی۔ ورنہ اپنا سلمان باندھ کر رکھنا۔ ٹرسٹ می! بلکہ الزبتھ بھی تمہیں برطانیہ میں نہیں رکھ سکے گی۔“

پین سے اس کے کراس بیگ کے اسٹریپ کو پوری شدت سے کھینچ کر وہ چلا گیا۔ وہ چلا گیا اور کیا کہہ گیا۔ امرجہ نے نہیں سنا تھا۔ وہ اسے نہیں سن رہی تھی۔ وہ اسے کیسے سن سکتی تھی۔ وہ تو۔

پھر سے ایک تیز سٹی کی آواز۔ چمک چمک۔ جیسے زنگ آلود وزنی انجن کی ریل سڑائے موت کے قیدی کا چچھا کرتی ہے۔ اندر جلا دھنڈھے بھاگی چلی جاتی ہو۔ کتنی جلدی ہے۔ جلا دھنڈھے کا سرتن سے جدا کرنے کی۔ وہ اس حالت میں آگئی جس میں کسی خونخوار درندے کے لیے لگائے گئے ہڈی توڑ لوہے کے وزنی شکنجے میں انسانی پیر آ جاتا ہے۔

اف۔ موت بھی اور تکلیف بھی۔ آہ۔ وہ لیاک ایپٹل تھی۔ اس پر ”آہ“ فرض نہ تھی۔ وہ بزنس اسکول کی طرف بھاگی۔ عالیان کو ڈھونڈنا چاہا۔ وہ نہیں ملا۔ اس کے چند دوستوں سے پوچھا۔ انہیں معلوم نہیں تھا۔ اس کا فون بند تھا۔ وہ تو کہا کرتا تھا وہ خود کو مار ڈالے گا مگلا س نہیں چھوڑے گا۔ مرجائے گا پر۔ تو کیا اس نے خود کو مار ڈالا تھا؟

تو کیا وہ مرجکا تھا۔ کیا واقعی۔ عالیان مار گریٹ مر چکا تھا۔ چند دن پہلے بچوں کے گالوں پر چٹکی بھرنے والا۔ اس سے بھی پہلے اس کے لیے کراسنگ پر قلابازیاں لگانے والا۔ اور۔ بھوری آنکھوں والا لارڈ میر۔ مر چکا تھا۔ اتنی جلدی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)





سمیرا حید



امردہ کی پیدائش کے وقت اتفاقی طور پر رونما ہونے والے چند ناگوار اور نقصان دہ واقعات کے سبب وہ اپنے خاندان میں ”منخوس“ مشہور ہو جاتی ہے۔ اس کے بابا اماں دادی اور تنہوں بہن بھائی دانیہ، عماد اور علی اسے اکثر جہنم جلی، منخوس، کالی نظر اور کالی زبان کہتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی مقلبی بھی ان ہی الفاظوں کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اپنی نحوست کے صبح شام قصے سن کر امردہ خود ترسی کا شکار ہو کر روتی رہتی ہے۔

پورے گھر میں صرف دادا ہی اس کی دل جوئی کرتے ہیں اور گھر والوں کی باتوں کو لغو قرار دیتے ہوئے امردہ کو بھی ان پر کان دھرنے سے منع کرتے ہیں۔ امردہ کی اپنے دادا سے خوب ہمتی ہے۔ وہ سارا دن ان کے ساتھ پنجاب لائبریری میں گزاراتی ہے۔ جہاں وہ لائبریرین تھے دادا اسے سمجھاتے ہیں کہ تم پڑھائی پڑھیں دو اور اسکالر شپ لے کر باہر ملک چلی جاؤ۔ امردہ اپنے بانی بہن بھائیوں کی طرح پڑھائی میں کمزور ہے، مگر دادا کی بات پر وہ ٹاپ کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دیتی ہے، مگر پھر بھی بہت اچھے نمبر حاصل نہیں کر پاتی۔ اسی دوران اس کی شادی کا سلسلہ چلتا ہے، مگر پندرہ روز قبل دولہا کی جوان بہن کے بیوہ ہو جانے پر اس کی شادی رہ جاتی ہے اور اس کی نحوست پر نفید لگ جاتا ہے۔ امردہ دل برداشتہ ہو کر نیند کی گولیاں کھا کر خود کشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد امردہ کی زندگی مزید خراب ہو جاتی ہے۔ وہ مختلف بیرون ملک کالج یونیورسٹیوں کے ہزاروں آن لائن اسکالر شپ فارم بھرتی ہے، مگر ہر جگہ سے انکار ہوتا رہتا ہے۔ بالاخر ماچس یونیورسٹی سے اسے اسکالر شپ مل جاتا ہے جو اس یونیورسٹی کی طلبہ سوسائٹی اپنے ذاتی فنڈ سے دیتی ہے جس کی رو سے امردہ کو تیس فیصد ادا کرنا ہوتا ہے باقی ستر فیصد کی ادائیگی ان کی طرف سے ہوگی۔ اس کے علاوہ دو دن کی میزبانی کے

مکمل ٹاؤل









بعد امرجہ کو اپنی رہائش اور اخراجات کا خوب دست کرنا ہو گا۔ یہ سب باتیں اسے برطانیہ پہنچنے کے بعد دانتہا تھیں۔ دادا جی امرجہ کے لیے پیسے اکٹھے کر کے اسے برطانیہ بھجوا دیتے ہیں۔ باقی اسے خود اپنے بل بوتے پر کرنا ہو گا۔ عذر، شرٹی، بیٹی لو اور لیلی کو اس کی ابتدائی ملاقات ہوتی ہے۔

امرجہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک کافی شاپ میں جاب کرنے لگتی ہے۔ اور لیڈی مہر کے گھر اس کی رہائش کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔ لیڈی مہر بے اولاد خاتون ہیں۔ انہوں نے اپنے شغل کا کام نامی اپنے ہاسل نمائندہ میں مختلف بچوں کو اولاد کی طرح رکھا ہے۔ ان ہی میں ایک علیان مارگریٹ ہوتا ہے۔ وہیں سادھنا، ویرا اور این اون سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ جاب کے دوران وہ ڈیرک کے ساتھ مل کر ڈاکومنٹری فلم بنانے لگتی ہے۔

اسی دوران امرجہ کے باپا جن کی اعظم ماریٹ میں قانون کی دکان ہوتی ہے، آگ لگ جاتی ہے جس سے ان کا بیس چھتیس لاکھ کا نقصان ہو جاتا ہے۔ انہیں ایک ہو جاتا ہے۔ امرجہ انہیں سلی دیتی ہے اور ڈاکومنٹری فلم سے ملنے والے پیسے ان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ لیڈی مہر بھی اسے ایک چیک دیتی ہیں۔ امرجہ وہ رقم بھی پاکستان بھجوا دیتی ہے۔ امرجہ کے والد بہت خوش ہوتے ہیں۔ امرجہ اپنی کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے جب علیان مارگریٹ کسی اسپائیڈر مین کی طرح اس کی کھڑکی میں بھاگتا ہے۔ امرجہ کی چیخ نکلتی جاتی ہے۔

علیان بتاتا ہے کہ اس کا کھربے وہ اس کے کمرے کی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا، تھوڑی دیر بعد گھر میں آوازیں گونجنے لگیں تو سادھنا نے بتایا کہ لیڈی مہر کا بیٹا آیا ہے۔ وہ لیڈی مہر کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ وہ لیڈی مہر کے بیڈ پر بٹھا انہیں کیک کھلا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ لیڈی مہر نے ایک بار بتایا تھا کہ ان کا بیٹا بھی اس کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے اور بہت قابل ہے۔

امرجہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا نام علیان تھا اور اس کی ماں کا نام مارگریٹ ہے۔ اسے عجیب سا لگنا چاہتا تھا؟ دوسرے دن لیڈی مہر کی سالگرہ تھی، جوان کے بچوں نے بڑے اہتمام سے منائی۔ انہوں نے امرجہ کو علیان کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے اسے ایک ادارے سے لیا تھا اور بڑی تن دی ہے اس کی تربیت کی ہے۔ امرجہ کو افسوس ہوا کہ اس کی اماں نے کبھی بیٹوں کی تربیت پر توجہ نہیں دی تھی۔ ویرا کا ساتھ امرجہ کو احساس دلایا تھا کہ عورت بھی مہار ہو سکتی ہے۔ علیان کی توجہ نے امرجہ کو ایک عجیب احساس سے دوچار کر دیا، وہ لا شعوری طور پر علیان سے متاثر ہو رہی تھی۔

لیڈی مہر کی لاڈلی بیٹی مورگن کی شادی میں امرجہ اور سادھنا شہمہ بالیاں تھیں۔ کالے سوٹ میں ملبوس علیان کی نظرس امرجہ پر مرکوز تھیں۔

ماچسٹریٹس ڈسٹرکٹ پریڈ (نئے سال کی پریڈ) تھی امرجہ کی چینی کلاس فیلو جی من نے امرجہ کو پریڈ میں حصہ لینے کا کہا۔ امرجہ ڈسٹرکٹ کے لباس میں تھی علیان نے پریڈ کے دوران امرجہ کو پریڈ کیا۔ اس نے صاف انکار کر دیا اور جھوٹ بولا کہ اس کی پاکستان میں منگنی ہو چکی ہے اور اس کی واپسی کے بعد اس کی شادی ہو جائے گی۔ علیان یہ سن کر شدید صدمہ کا شکار ہو گیا۔

امرجہ انکار کر کے خوش نہیں تھی۔ ویرا نے اس سے اس کی ادا سی کی وجہ پوچھی۔ ہارٹ راک کیفے میں ڈی جے ایک خاص ڈسک جو کارل نے دی تھی لگا ہے۔ کیفے میں علیان بھی موجود ہوتا ہے۔ ڈسک کے چلتے ہی ————— کیفے میں موجود تمام اسٹوٹس علیان کو دیکھنے لگے ہیں۔ یہ وہ گفتگو ہوتی ہے جو امرجہ نے ویرا سے علیان کے بارے میں کی تھی۔ اسے ناجائز ہونے کی گالی دی تھی۔ اس کی ماں کے کردار پر شبہ ظاہر کیا تھا۔ علیان کی ماں اس کی اب تک کی زندگی واحد محبت "مارگریٹ جوزف"۔

علیان کی ماں مارگریٹ جوزف اپنی لبنانی شوہر کو نوٹ کر چاہتی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ مارگریٹ گویا جیتے جی مر گئی اور جب اس کے شوہر نے اسے لعنت قرار دیا تو وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ مارگریٹ جوزف کے مرنے کے بعد علیان کو بے سارا بچوں کی دیکھ بھال کے ایک پرائیویٹ ادارے میں داخل کر دیا



گیا۔ اس ادارے سے لیڈی مہر عالیان کو گود لے لیتی ہیں۔ لیڈی مہر عالیان کی زندگی میں اپنی ماں کے بعد دوسری عورت تھی جس نے اسے پاردیا۔ بے لوث محبت کی۔  
 عالیان کی زندگی میں آنے والی تیسری عورت ”امردہ“ تھی جسے اس نے ٹوٹ کر چاہا اور اس کے ہاتھوں ذلت سہی۔ وہ امردہ اور دیر کی باتوں کا ٹیپ سن کر بری طرح ٹوٹ جاتا ہے۔  
 بہت دنوں تک عالیان یونیورسٹی نہیں آتا۔ کارل امردہ کے پاس آکر اس سے کہتا ہے کہ اگر وہ عالیان کو ڈھونڈ کر نہیں لائی تو وہ اپنا سامان باندھ کر گھر پھر ملکہ الڑتہ بھی اسے برطانیہ میں نہیں رکھ سکے گی۔  
 امردہ کارل کی باتیں سن کر حیران ہوتی ہے۔ کارل امردہ کو بتاتا ہے کہ اس کے اور ویرا کے درمیان ہونے والی تمام باتوں کی ریکارڈنگ اس کے پاس ہے اور اس ریکارڈنگ کو عالیان نے بھی سن لیا ہے۔ امردہ کو کارل کی بات سن کر ایسا لگتا ہے اس کے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا ہے اور اسی کیفیت میں گھری وہ بڑس اسکول کی طرف بھاگتی ہوئی جاتی ہے عالیان کو ڈھونڈتی ہے لیکن وہ اسے نہیں ملتا۔ امردہ سوچتی ہے کہ عالیان تو کہا کرتا تھا کہ وہ خود کو مار ڈالے گا لیکن کلاس نہیں چھوڑے گا تو کیا اس نے خود کو مار ڈالا تھا۔؟

## چوتھی قسط

ہوں اور وہ اس پر راضی ہو۔  
 ہونی ہو چکی ہے مطلب۔۔۔ اس کی سب تدبیریں حساب کتاب الٹا ہی ہوا۔۔۔ وہ تالاق کی تالاق ہی رہی۔  
 اسٹوڈنٹس آجائے ہیں۔۔۔ برٹلی ہوا چل رہی ہے۔۔۔ دھند ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے اور ایسا کرتے بہت خوفناک لگ رہی ہے۔  
 آکسفورڈ روڈ ایسے رواں دواں ہے جیسے ابھی ابھی وہاں سے شور مچاتی چیختی چنگھاڑتی پرانے انجن کی ریل گاڑی قطعاً نہیں گزری۔  
 باغ کے ایک کونے میں وہ اکیلی بیٹھی ہے۔۔۔ جیسے ساری دنیا تباہ ہو چکی ہے۔۔۔ اور اب وہ۔۔۔ اب وہ اکیلی رہ گئی ہے۔۔۔ بالکل اکیلی۔۔۔ نئے باغ میں پچھی گھاس عذراں میں پیوست ہمارے دور اکیلی۔  
 سیاہ بلوری پیالے آنسوؤں سے بھر بھر گئے۔۔۔ گود میں ہاتھ رکھے وہ اتنی بڑی یونی میں۔۔۔ اتنی بڑی دنیا میں اکیلی ہوئی بیٹھی ہے۔۔۔ افسوس۔۔۔ برائے نام حصے میں آتے ہی سہی وہ عالیان کو کھوپچی ہے۔ اور محبت کا ایک ہی پنجرہ ہے ”دنیا“ اس کا ایک ہی تصور ہے۔ ”دنیا دار ہونا“ اس پنجرے پر ایک ہی تالا لگتا ہے ”روایات

لرزنے کی ایک پرورد کیفیت امردہ کے وجود میں جاگی اور اسے گرنے سے بچنے کے لیے قہری دیوار کا سہارا لیتا رہا۔ اس کے چار اطراف کی ہوائے اپنا رخ اس سے پھیر لیا، اور ہوا کی اس خود غرضی پر اس کا دم گھٹنے لگا۔  
 کراس بیگ بہت وزنی ہو چکا تھا۔ اس کا وزن امردہ سے اٹھایا نہیں جا رہا تھا۔ وزنی تو اس کا اپنا وجود بھی ہو چکا تھا۔ امردہ کے لیے اسے قائم رکھنا محال ہو رہا تھا کہ عزت بھی رہ جائے اور چوٹ بھی نہ لگے۔  
 اسے یاد ہی نہ رہا کہ اسے اپنی پہلی کلاس لینی ہے اگر کوئی اسے اس وقت پکارا تو اسے یہ بھی یاد نہ آتا کہ امردہ نامی لڑکی خود وہی ہے۔  
 ایسے چلتی جسے چلنا تو ہر گز نہیں کتے، وہ باغ کے ایک کونے میں بیٹھ گئی، چپ۔۔۔ خاموش۔  
 ”دنیا میں اتنا سنا کیوں ہے۔“  
 ”نہیں! یہ شور۔ اتنا شور۔ یہ کہاں سے پھوٹا پڑتا ہے۔؟ کان پھٹ رہے ہیں۔۔۔ کچھ سنائی نہیں دے رہا۔۔۔ کان ہرے ہو چکے ہیں۔“  
 اب وہ گود میں ہاتھ رکھے بیٹھی ہے، جیسے دائرے کی صورت اس کے گرد لاؤ بھڑکنے کی تیاریاں کی جاتی



”مگر اسے کہیں جانا ہو تو وہ کہاں جاتا ہے۔ اس نے مجھے نوٹس دینے کے لیے کہا تھا اور اب۔۔۔ اس کا کچھ اتنا پتا ہی نہیں۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنی آواز کو کس ردِ ہم پر لے آئے کہ اس کی چوری نہ پکڑی جائے، آتش دان کے قریب آکر وہ سلاخ سے آگ کو بلاوجہ کریدنے لگی۔

”جائے گا کہاں۔۔۔ وہ مجھے بتائے بغیر شہر نہیں چھوڑا کرتا۔“

آگ کو کریدتے اس کے ہاتھ رک سے گئے ”یعنی اس بار وہ یہ نافرمانی کرچکا ہے وہ اپنی ماں کو بغیر بتائے کہیں جاچکا ہے۔“

”تم یونیورسٹی سے کیوں آگئیں؟“

”بس ایسے ہی۔۔۔ دل نہیں چاہ رہا تھا کلاسز لینے کا۔“

”چھاتے تم نے تو ایک بار کہا تھا تم مہرجاؤ گی اپنی کلاسز نہیں چھوڑو گی۔“ لیڈی مہرنے ہنس کر کہا۔

اس نے آتش دان کی کارٹس پر اپنے دائیں ہاتھ کا پنجہ گاڑ دیا۔ عالیان سے سمجھ کر اس نے یہ بات دو تین لوگوں سے کی تھی۔ وہ گردن اکڑا کر یہ بتانا چاہتی تھی کہ اس کے لیے اس کی تعلیم کس قدر اہم ہے اتنی زیادہ کہ صرف موت ہی درمیان میں حائل ہو کر روک سکتی ہے۔ تو کیا موت حائل ہو چکی تھی؟۔۔۔

ایسا ہی ہوا ہے یقیناً ”پھر تو۔۔۔“

”جواب پر جانے سے پہلے تم Anselm ہال چلی جانا۔“

”میں چلی جاؤں گی۔۔۔ آپ پریشان نہ ہوں وہ ٹھیک ہو گا۔“

”وہ میرا بیٹا ہے، وہ اپنا خیال رکھنا جانتا ہے، اپنے لیے نہیں۔ میرے لیے۔“

امرحہ کو ایک دم سے احساس ہوا کہ وہ کافی دیر سے آگ کے اتنے قریب کھڑی ہے، لیڈی مہر کی اس بات نے اسے چونکا دیا تھا۔ ہاں وہ ٹھیک ہو گا۔ کسی کے لیے نہیں۔۔۔ صرف ماما کے لیے۔۔۔

کا۔۔۔ اس سوال کا اس سوال کا۔۔۔ اس خوف کا۔۔۔ اس انجام کا۔۔۔ یہ وہ۔۔۔ بس سب سوالیہ۔۔۔ سرکشی کی اجازت نہیں۔۔۔ بغاوت کا حکم نہیں۔۔۔

اس پنجرے کی سلاخوں کی بنیادیں خود غرض معاشرے کے کھوکھلے، بھڑبھڑے اصولوں سے ہرگز ابھری دھرتی کے سینے سے پھوٹی ہیں۔ اور اصول و ضوابط کی فضا میں غرور و تکبر سے تن جاتی ہیں۔

یہ پنجرہ۔۔۔ اس پنجرے کا قیدی حساب کتاب کیوں نہ کرے۔ وہ سارے سوالوں کا جواب نکال لے گا تو ہی نالا کھٹے گا۔۔۔

اور سب سوالوں کے جواب کون فاتح ہے جو نکال پاتا ہے۔۔۔

امرحہ اتنی عقل مند تھی کہ عالیان کو پہچان گئی تھی اور اتنی ہی بے وقوف کہ اسے مانہ سکی۔

اور ذرا بتائے مشرق میں وہ قلم دوات کہاں ملتی ہے جو ایسی ”محبت“ کرنے کی تحریری اجازت دیتی ہے۔ ایسی محبت جس کی اہمیت مٹی کے کچے ٹوٹے ہوئے گھڑے سے بھی گئی گزری ہوتی ہے۔ وہ انھی اور گھر آگئی۔

”آپ کی عالیان سے بات ہوئی؟“ اس نے آتے ہی لیڈی مہر سے پوچھا۔

”دونوں سے اس نے مجھے فون نہیں کیا۔۔۔ اس کا فون بند ہے۔۔۔ کل تم اس سے یونیورسٹی میں مل سکتی ہو۔۔۔ پوچھنا اس کے موبائل کے ساتھ کیا ہوا ہے۔۔۔ کل ضرور وقت نکال کر اس سے مل لینا۔“

وہ زندگی کا سارا وقت نکال کر اس سے مل لیتی مگر اجازت دے دی جاتی۔ اس پر یہ اجازت جائز کر دی جاتی۔۔۔

وہ لیڈی مہر کو بتانہ سکی کہ وہ یونیورسٹی نہیں آیا۔ اور یہ بھی کہ ان کے فرماں بردار گاڈ لے بیٹے کے منہ پر اس نے پھڑوے مارے ہیں اب دکھ اور شرمندگی کو لیے وہ خود کو چھپا رہا ہے۔ خود کو گم کر کے وہ تلاش کرتا پھر رہا ہے۔۔۔



رہی تھی۔ اس کے پیچھے لگی۔  
”تم اتنی تیزی سے کہاں جا رہی ہو۔ تمہیں  
علوم بھی ہے کہ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

اس نے جیسے سنا ہی نہیں اور وہ اپنی بس میں بیٹھ  
گئی۔ ویرا اپنی سائیکل پر آتی رہی بس کچے پیچھے پیچھے کہ  
کیس وہ درمیان میں ہی اتر کر کہیں اور نہ چلی جائے۔  
اس نے آتے ہی اپنا کمرہ لاک کر لیا، ویرا نے لیڈی مہر  
کی پروا کے بغیر اتنی زور زور سے دروازہ بجایا کہ اسے  
دروازہ کھولنا ہی پڑا۔ وہ لیڈی مہر کو کس منہ سے اس  
سارے تماشے کی تفصیل بتاتی جو اس کے اور ویرا کے  
درمیان ہوتا۔

”دوبالغ افراد غصہ کرنے لڑنے سے پہلے آرام سے  
بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں۔“ ویرا نے اپنے قد کی طرح  
لبے ہاتھوں کو اس کے شانوں پر رکھ کر نرمی سے کہا۔  
”بالغوں میں سے ایک بالغ کچھ بھی کر سکتا ہے۔  
کچھ بھی۔ خاص کر اگر وہ چھپا رستم بھی ہو تو۔“  
شانوں پر سے اس کے ہاتھ جھٹک کر اس نے تیز آواز  
میں کہا۔

ویرا کو اس کے انداز پر ایک جھٹکا لگا اس کی گلابی  
رنگت پھینکی سی پڑ گئی۔ اس کی آنکھوں سے گہرا ملال  
چھلکنے لگا۔

”تم اتنی سی بات پر ایسے ری ایکٹ کر رہی ہو؟“  
اس نے یہ کہتے محسوس کیا کہ زندگی میں پہلی بار اس کی  
آواز ایسے ارتعاش کا شکار ہوئی ہے۔

”اتنی سی بات۔ تم نے میری ساری باتیں ریکارڈ  
کر کے علیان کو دے دیں۔“ کس قدر شرمناک  
حرکت ہے۔ جانتی ہو۔ اسے کارل نے بھی سنا اور  
کچھ دوسرے اسٹوڈنٹس نے بھی۔“

ویرا کی آنکھوں میں ملال کی جگہ خوف نے لے لی۔  
کمانڈو کی طرح ساری دنیا کو اپنے پیچھے رکھنے والی نے  
کسی قدر سہم کر امرچہ کو دیکھا۔ ایسا کرتے ویرا

بلاشبہ بہت بدینیت لگی۔

”علیان کو نہیں۔ کارل کو امرچہ۔!“

”دیکھو، وہند نے آج ہانچسٹر پر کیسی یلغار کی ہے۔“  
وہ کھڑکی کے پاس بیٹھی ہانچسٹر اترنے والی وہند پر غار  
ہو رہی تھیں۔

امرحہ نے ان کی پشت سے ان کے چہرے پر چھائی  
محسوسیت کو بچھتاوے کے احساس میں گھر کر دیکھا  
اس کا جی چاہا وہ ان کے قدموں میں اپنا سر رکھ دے اور  
عالیان سے پہلے ان سے معافی مانگ لے۔ انہیں  
بتائے کہ ان کا بیٹا نہ جانے کہاں چلا گیا ہے اور ایک  
صرف اس کی وجہ سے۔

پہلی بار وہ علیان کے ہال ST -Anselm  
آئی۔ پر جوں میں یونیورسٹی نہیں آیا تھا وہ شام تک  
ہال کیسے آتا۔ وہ اپنی جاب پر آئی۔ کسمز صبر سے  
اس سے اپنا بل ہواتے رہے۔ اس کی دس انگلیاں جلد  
تھیں وہ حرکت کرنے سے انکاری تھیں۔ ایک  
معمولی سے جوتے کا اس نے دس ہزار پونڈ کا بل  
بنادیا۔

”امرحہ! میں آپکی ہوں۔“ ویرا اس کے سر پر  
کھڑی تھی، پچھلے دس منٹ سے کھڑی تھی۔

امرحہ اپنے کام میں مصروف رہی۔ اس نے سنا ہی  
نہیں کہ اسے مخاطب کیا گیا ہے۔

”امرحہ!“ ویرا نے دس منٹ مزید صبر سے کھڑے  
رہنے کے بعد اسے مخاطب کیا۔

”میں فارغ نہیں ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ ایک گھنٹہ ہے تمہارا دورانیہ ختم  
ہوئے میں۔ میں کہنے میں۔“

”میرے لیے انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم  
جا سکتی ہو۔“

”میں ساتھ لے کر جاؤں گی۔“

”مجھے تمہارے ساتھ اب نہیں جانا۔“

”یہ فیصلہ بہ مات کرنے کے بعد کریں گے۔“

”فیصلہ ہو چکا ہے۔“ وہ ویرا کے کمرے کی ایک  
ایک چیز تھیں نہیں کر آئی تھی۔ ایک گھنٹہ بعد وہ  
اسٹور سے نکلی تو ویرا جو اسٹور کے ایک طرف نکل



اس کا خیال تھا یہ سب ST- Anselm ہال میں ہوا ہوگا، پر وہ تماشا تو ہارٹ راک میں لگا تھا جہاں یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس کا جم غیر ہوتا ہے۔ تو اس کی زبان سے کی گئی ہنگ سب نے سن لی۔ جس کی وہ عزت کرتی تھی اس کی سرعام بے عزتی کر دی۔  
”دور! تم نے کیا کیا؟“ اس کی آواز میں آنسو پھٹنے لگا۔

”کیا کیا تم نے۔ تم مجھ سے کرید کرید کر وہ سوال پوچھتی رہیں۔ وہ سب۔ وہ سب جو بچ بھی تھا۔ اور جو جھوٹ بھی تھا۔ تم مجھ سے وہ کیوں پوچھتی رہیں۔ تم۔ تم تو سستی ہو کہ تم میرے ملک کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتی ہو۔ وہاں کے میدان، پہاڑوں، سمندروں، موسموں، تاریخ کے بارے میں۔ اتنا کچھ جانتے تم نے وہاں کے لوگوں کے بارے میں کیوں نہ جانا۔ تم نے یہ جانتا کیوں ضروری نہ سمجھا کہ مشرقی لڑکیوں کا جھوٹ کیسا بچ ہوتا ہے۔ بچ کو کیسے خفیہ تابوتوں میں لپیٹ کر دفن کیا جاتا ہے کہ کوئی ان کی خوشبو نہ پالے۔ ویرا تم تو کہتی تھیں تم مجھے سمجھتی ہو۔ اب تم مجھے کیوں نہ سمجھیں۔ میں تو تمہاری دوست تھی۔“  
ویرا کو ”دوست تھی“ کے لفظ کی ادائیگی نے تکلیف دی۔

”تم میری دوست ہو امرحہ! اسی لیے مجھے وہ سب برا لگا جو تم نے عالیان سے کہا اور اس کے لیے سوچا۔ تم نے اسے انکار کیا۔“

”انکار!“ امرحہ کو پھر سے زیر لب دہرانا پڑا۔ ”تمہیں چند سال ہمارے معاشرے میں گزارنے ہوں گے ویرا۔ میرے خاندان میرے بابا، اماں، ان سب لوگوں کے ساتھ۔ امرحہ کی جگہ اگر کسی بھی مشرقی لڑکی کی جگہ اگر۔ تم سمجھ جاؤ گی۔ انکار کیوں ضرور ہو جاتا ہے۔“  
”میں نہیں جانتی یہ سب۔ سب بے بنیاد باتیں ہیں۔“

امرحہ کو بات سمجھنے میں کچھ وقت لگا ”کیوں۔ کیوں کیا ایسا۔ کیا مصیبت آئی تھی تم پر ویرا۔؟“  
”کارل نے مجھ سے کہا تھا۔ اس نے عالیان اور تمہیں پریڈ میں باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ تھوڑا بہت سن بھی لیا تھا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں تم سے پوچھوں۔ وہ عالیان کا دوست ہے۔ عالیان بہت اپ سیٹ تھا پریڈ کے بعد سے۔ کارل جانتا چاہتا تھا اس کی وجہ۔“

”وہ عالیان کا دوست نہیں ہے۔“ امرحہ کس قدر سہم کر چلا اٹھی۔  
”وہ عالیان کا دوست ہے امرحہ۔ صرف وہی ایک دوست ہے۔“

”دوست ایسا کرتے ہیں جیسا اس نے کیا۔ جیسا تم نے کیا۔“ امرحہ کو یقین سا ہونے لگا کہ وہ اپنا چچن و قرار تا عمر کے لیے کھو دے گی۔ اور پھر کبھی نہیں پاسکے گی۔

”امرحہ! اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ وہ ٹھیک ٹھیک سب جانتا چاہتا ہے۔ جب میں تم سے بات کر رہی تھی تو فون پر وہ سن رہا تھا مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ فون کال ریکارڈ کر لے گا۔ اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ ہارٹ راک میں وہ ڈسک چلوادے گا۔“

امرحہ نے ویرا کی شکل کو پہچاننے کی کوشش کی۔ کمزری کے جا لے سی بینائی نے پھر سے امرحہ کو اندھا کرنے کی کوششیں کی۔ پلکوں کی جنبش امرحہ پر گراں گزری۔

”ہارٹ راک۔ ڈسک پر۔؟“  
امرحہ کی شکل کی طرف دیکھتے ویرا رو دینے کو ہو گئی وہ تو اتنی ہمار تھی پھر اب کیسے وہ رو دینے کو ہو گئی۔  
”ہاں! کارل نے وہاں ڈی جے سے چلوادی۔ ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے اسٹوڈنٹس بھی تھے وہاں۔ اور عالیان بھی۔ مجھے بھی آج ہی یونیورسٹی سے معلوم ہوا ہے۔“

”اور عالیان۔؟“ امرحہ بڑبڑائی۔



# پیارے بچوں کے لئے پیاری پیاری کہانیاں



بچوں کے مشہور مصنف

**محمود خاور**

کی لکھی ہوئی بہترین کہانیوں  
پر مشتمل ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے  
آپ اپنے بچوں کو تحفہ دینا چاہیں گے۔

ہر کتاب کے ساتھ 2 ماسک مفت

قیمت - 300/- روپے  
ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے  
مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

امرحہ ایسے استہزائیہ ہنسی کہ دیر اکو سب جواب مل گئے جیسے۔  
”وہ میرا دوست تھا ویرا۔ باتیں کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک وقت تھا۔“  
”وہ دوست بنانے کے لیے جائز ہے۔ وہ لائف پارٹنر بنانے کے لیے ناجائز کیوں ہے؟“  
”میں نے اس کی بے عزتی کر دی۔ وہ مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔“  
”نہیں اس کی ناراضی کی فکر کیوں ہے؟“  
”وہ مجھے ناپسند کرے گا اب۔ وہ مجھے منافق سمجھے گا۔“

”تم نے منافقت کی ہے۔“  
”میں نے منافقت کی ہے؟“ سرگوشی کی صورت اس نے خود سے سوال کیا۔ اور ملنے والے جواب نے اسے شرمندہ کر دیا۔  
”وہ تمہارا دوست ہے تو ٹھیک۔ کچھ اور بنے تو غلط۔ ایک ہی انسان کو اچھا اور برا بناری ہو۔ منافقت نہیں ہے کیا یہ۔ وہ تمہیں برا سمجھے گا۔ تمہیں اس بات کا خوف ہے اور تم اسے برا سمجھتی رہیں۔“

”تم نے میرے ساتھ ٹھیک نہیں کیا ویرا۔!“  
”تم نے خود اپنے ساتھ ٹھیک نہیں کیا امرحہ۔ اسی لیے کہتی ہوں عقل سے۔“  
”عقل ہے میرے پاس۔ لیکن اس عقل سے پہلے خوف ہے۔ بڑا۔ ہیبت ناک اڑدھا جیسا۔“  
”اس خوف کو دبا دو۔ برف میں گردن تک دھنسا دو اسے۔“

امرحہ کو خاموش ہو جانا پڑا۔  
”اسے حد درجہ تکلیف پہنچی ہے تو وہ یوں گم ہو گیا ہے نا؟“

اس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ جس وقت وہ امرحہ سے وہ سب باتیں کر رہی تھی اس وقت اسے گمان بھی نہیں تھا کہ صورت حال ایسی



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)



والا۔ صرف اس کے پاس۔۔۔ بہانے بہانے سے اس کے ساتھ رہنے والا۔

”یہ تمہیں لائبریری میں ملے گا ورنہ کہیں نہیں۔“

”اب یہ تمہیں امرجہ کے آس پاس ملے گا ورنہ کہیں اور ہرگز نہیں۔“

اس کی آنکھوں کی پہیلی بوجھ لینے والا۔۔۔

عالیان۔۔۔ اس کی پیدائش کے بعد سے سب اس سے دور رہنے والے تھے۔ دادا کے بعد ایک وہی تھا جو بھاگ

بھاگ کر اس کے پاس آتا تھا۔ تھا کیا امرجہ میں کہ وہ اس کے لیے ایسا مقناطیس بن چکی تھی۔۔۔ وہ اس سے

خفا نہیں ہوتا تھا۔۔۔ وہ اس پر خفا نہیں ہوتا تھا، وہ اس کی باتوں پر ایسے ہنستا تھا جیسے ہنسا اس نے ابھی ابھی

اس کی باتیں سن کر ہی سیکھا ہے۔۔۔ اگلے دن وہ پھر یونیورسٹی نہیں آیا۔۔۔ جب پر

جانے سے پہلے وہ ہارٹ راک کیسے آگئی۔ اس کے پوچھنے پر اسے بتایا گیا کہ وہ اندر اپنی ڈیوٹی پر ہے۔

”میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔ میرا نام امرجہ ہے۔ آپ اس سے کہہ دیں۔“ اس نے کاؤنٹر

بوائے سے کہا۔۔۔ کاؤنٹر بوائے واپس آیا تو اس کا منہ دیکھنے لگا۔

”کیا وہ آ رہا ہے؟“ امرجہ کو خود ہی پوچھنا پڑا۔

”معلوم نہیں۔۔۔ وہ تو خاموشی سے مجھے دیکھنے لگا کوئی جواب نہیں دیا۔“ البانوی کاؤنٹر بوائے اپنے

کام میں مصروف ہو گیا۔

”میرا نام بتایا؟“ امرجہ کو یقین تھا وہ ٹھیک تلفظ سے اس کے نام کی ادائیگی نہیں کرے گا ہوگا۔

البانوی کو جیسے برا لگا۔ ”ظاہر ہے۔“

امرجہ نے ایک ٹھٹھن زدہ سانس لیا اسے اپنے دل کی کھال سکڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”مطلب کہ وہ نہیں آ رہا۔۔۔ لیکن شاید آ ہی جائے۔“

ہو جائے گی۔۔۔ یہ ٹھیک تھا کہ وہ امرجہ کے انداز اور جوابات سے چرتی چلی گئی اور اس پر سوالات کی بوچھاڑ

کر دی اور اس دوران وہ یہ بھی بھول گئی کہ کارل یہ سب سن رہا ہے۔۔۔ کارل نے اس سے کہا تھا کہ

عالیان کے ساتھ کچھ تو ایسا ہوا کہ وہ اس قدر اب سیٹ ہے۔۔۔ اور یہ بات امرجہ سے بہتر کوئی نہیں بتا سکتا تھا

کیونکہ اب تو سب ہی جان گئے تھے کہ عالیان کیسے سائے کی طرح امرجہ کے پیچھے پیچھے رہا کرتا تھا۔۔۔

”عالیان ٹھیک ہوگا امرجہ۔۔۔ وہ واپس آ جائے گا۔۔۔ وہ پڑھا لکھا ہے۔ ایسی ویسی کوئی حرکت تو نہیں کر سکتا۔۔۔“

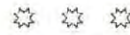
امرجہ نے جیسے سنا ہی نہیں۔۔۔ وہ اپنے بستر میں گھس گئی اور خود کو لحاف میں دبایا۔۔۔ ویرا کمرے سے

چلی گئی تو وہ لحاف سے نکلی۔ اب وہ جہاں کہیں بھی ہو گا۔۔۔ کتنا بھی ٹھیک ہو گا۔۔۔ لیکن تکلیف سے

انجان نہ ہو گا۔۔۔ وہ کتنا بھی بہادر ہو گا ایک بار تو ٹوٹا ہی ہو گا۔ اس نے محبت کی۔۔۔ اس کا اقرار کیا۔۔۔ اور

اسے ایسے دھکا دیا گیا۔۔۔ اس کا سارا علم بھی اسے یہ سمجھا دینے سے قاصر رہا

ہو گا کہ اس کے ساتھ جو ہوا اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔۔۔



مزید دو دن گزر گئے عالیان یونیورسٹی نہیں آیا۔ وہ بال بھی نہیں گیا تھا۔ کارل ایک بار پھر اسے سنجیدگی

سے دھمکا گیا تھا۔ ویرا نے وہ ریکارڈنگ لادی تھی جو ہارٹ راک میں چلائی گئی تھی۔ ساری رات امرجہ

اس ریکارڈنگ کو سنتی رہی تھی۔ وہ عالیان کی جگہ خود کو کھڑا کر لیتی اور امرجہ کا ہنک آمیز تلخ انداز سنتی۔ اور

بے مول سی ہو جاتی۔۔۔ عالیان کی جگہ۔۔۔ وہ کبھی بھی عالیان کی جگہ نہیں

آ سکتی تھی۔۔۔ اس کے لیے باغ سے پھول توڑ کر لاتا ہوا۔۔۔

بزاروں کے مجمع میں اسے پہچان کر اس کے پاس آنے



اور پانچ گھنٹے بعد وہ باہر آیا۔۔۔ وہ اگر وہ عالیاں مار گریٹ ہی تھا تو۔۔۔ امرجہ کو اسے پہچانے میں کچھ وقت لگا۔۔۔ اس کی شبیہ وہی تھی۔۔۔ وہی ناک نقشہ، وہی صورت۔۔۔ پھر بھی وہ عالیاں نہیں تھا۔۔۔ وہ شرط لگاتی اور جیت جاتی وہ عالیاں ہو ہی نہیں سکتا تھا۔۔۔

اس کی آنکھوں میں سارے جہاں کے اندھیرے آن بے تھے۔۔۔ وہ عالیاں ہی ہو تا تو ایسے اندھیروں کو اسے اندر پڑاؤ کی اجازت دیتا؟ نہیں کبھی نہیں۔۔۔ باہر نکلتے ہی اس کی نظر امرجہ پر پڑی اور وہ پھر بھی نہیں رکا۔۔۔ دیکھا وہ عالیاں نہیں تھا۔۔۔ رات کے اس وقت۔۔۔ ایسے امرجہ کو انتظار کی حالت میں کھڑا دیکھ کر بھی وہ نہیں رکا تھا۔۔۔ تو وہ عالیاں کیسے ہو سکتا تھا؟

”عالیاں!“ اسے لپک کر اس تک جانا پڑا۔۔۔ اس نے رکنے میں تامل کیا۔۔۔ عالیاں نے امرجہ کے لیے رکنے میں تامل کیا اور امرجہ کو ایسے دیکھا جیسے کہتا ہو۔۔۔

”خاتون میں ایچھے مزاج کا مالک انسان نہیں رہا۔۔۔ مجھ سے دور رہیں۔۔۔ مجھ سے دور رہا جائے۔۔۔“

اس کے اتنے قریب جا کر امرجہ کو اس سے ایک قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔۔۔ اس کے اعصاب ایسے تھے ہوئے اور ٹھنڈا کر دینے والے کیوں ہیں۔۔۔ روشنی جو اس کے وجود سے آرہا ہوئی لگتی تھی وہ کہاں ہے۔۔۔ اس کے آس پاس اتنا اندھیرا کیوں ہے۔۔۔ وہ تو عالیاں سے بات کرنے آئی تھی۔۔۔ وہاں کہیں عالیاں تھا ہی نہیں تو اب وہ کس سے بات کرے۔۔۔ اور۔۔۔ اب وہ روشنیاں منعکس کرتے عالیاں کو کہاں ڈھونڈے۔۔۔

”تم کہاں تھے؟“ جس شدت سے وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی اس شدت سے پوچھ نہ سکی، سوال اس نے پوچھا تھا جبکہ سوالیہ وہ اسے دیکھنے لگا تھا۔۔۔

”میں بہت دیر سے یہاں کھڑی انتظار کر رہی ہوں۔“ اس نے اس بات کو جان بوجھ کر اس انداز میں بتایا کہ ترس کھا کر پرانا عالیاں واپس آ جائے۔۔۔

”کس کا انتظار کر رہی تھیں؟“ سوال میں لپٹ کر کیا جواب دیا تھا اس نے، وہ ابھی

یاد نہ جائے۔۔۔ شاید عالیاں باہر آ ہی جائے۔۔۔ ابھی بس کچھ ہی دیر میں۔۔۔

وہ ہارٹ ڈاک کے باہر کھڑی ہو گئی۔۔۔ اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیے۔۔۔ مفکر کے کونے سے آنکھوں کی نمی کو صاف کرتے۔۔۔ بے بسی سے پرنٹ ورک کے میلے کو دیکھتے، اور حیرت زدگی سے ہنستے مسکراتے چروں کی مسکراہٹ پر دکھ کا اظہار کرتے اس نے خود کو پایا۔۔۔ کھڑے کھڑے اس پر کئی موسم آ کر گزر گئے۔۔۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔۔۔ عالیاں باہر نہیں آ رہا تھا۔۔۔ یعنی وہ نہیں آنے والا تھا۔۔۔ اس نے اپنے اسٹور فون کیا کہ وہ نہیں آ سکتی جاں۔۔۔ وہ چھٹی تھیں کرتی تھی۔۔۔ ایسے پہلی بار فون کر کے اس نے کہا۔۔۔

منیجر نے تشویش سے پوچھا ”تم ٹھیک ہو۔۔۔ گرم خطے کے لوگوں کو ٹھنڈا کاغذ بہت جلدی چڑھتا ہے۔“ اس کا منیجر ایک نیم مزاحیہ انسان تھا وہ کسی نہ کسی طرح ہر بات میں مذاق کا پہلو ضرور نکال لیتا تھا۔۔۔

”نہیں بخار نہیں ہے۔“ اس نے بمشکل کہا۔۔۔ ”بخار نہیں ہے تو آ کیوں نہیں رہیں۔ کیا گھر کی یاد کا نزلہ ہوا ہے؟“

”وہ میرے درد ہے۔۔۔“ ”درد ہے، سر میں؟“ امرجہ کے انداز پر وہ بخنجدہ ہوا۔۔۔

”ہاں۔۔۔ نہیں۔۔۔ بس بہت درد ہے۔۔۔“ اس نے جھٹ فون بند کر دیا۔۔۔

کر اس بیگ کی اسٹریپ میں ہاتھ دیے وہ ٹھلنے لگی، بہت سے ہائے پہلو دو سنتوں نے رک کر پوچھا کہ وہ وہاں ایسے کیوں کھڑی ہے۔۔۔ اندر کیوں نہیں آ رہی۔۔۔ یا جاکیں نہیں رہی۔۔۔

وہ شرمندہ ہو رہی تھی ہمانے بناتے، جھوٹ بولتے۔۔۔ لیکن ظاہر یہ ہے یہ شرمندگی اس شرمندگی کے آگے بہت معمولی تھی جو اس کیسے میں عالیاں نے جھیلی ہوگی۔۔۔ پہلی بار پھر اور دو سری بار تذلیل۔۔۔



کامل توجہ سے امرجہ کو دیکھنے لگا۔

ہارٹ راک کیفے کے آس پاس۔۔۔ اتنے بڑے دی پرٹ ورک کی حدود کے اندر کھڑے امرجہ کو کوئی ایک بھی چیز ایسی نہ ملی جس پر وہ اپنی نظریں ٹکاسکتی۔  
”میں جانتا تھا کہ میں کسی خاندان کا حصہ نہیں ہوں۔ میرا کوئی باپ نہیں ہے، لیکن اس حقیقت سے صحیح معنوں میں مجھے تم نے روشناس کروایا۔“  
وہ خاموش ہوا۔

امرجہ نے چاہا کہ وہ خاموش ہی رہے اگر وہ ایسے ہی بولتا رہا تو وہ اپنی باقی ماندہ زندگی کیسے گزارے گی۔  
”مجھے انتہا خراب سمجھتی تھیں تم۔ مجھے ترس آتا ہے خود پر جب جب میں یہ سوچتا ہوں کہ تم اتنی ناپسندیدگی اپنے اندر رکھ کر مارکٹ جیسی عورت کے بیٹے سے ملتی رہیں۔ تم واقعی ایک انسان دوست لڑکی ہو۔ بہت رحم دل۔ جو کسی کو کتنا بھی ناپسند کرے اس پر ظاہر نہیں کرتی۔ تم نے مجھ پر بھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ لیکن شکریہ کامل کا۔“  
”جو تم نے سن لیا وہی سب نہیں ہے۔“ عالیان کو دیکھ کر بغیر اپنے آنسو روک کر اس نے کہا۔

”جتناسن لیا ہے اس نے میرے لیے میرا سب ختم کر دیا ہے۔ میں ایک ناجائز بچہ ہوں۔ ناجائز۔ میری ماں ایک بری عورت تھی۔ جو تم کہہ چکیں وہ بھی اور جو تم نہیں کہہ سکیں وہ بھی میں سب سن چکا ہوں۔  
کچھ چکا ہوں۔ میرا مذہب کیا ہے۔ میں عیسائی ہوں، یہودی یا کچھ بھی نہیں۔ میں وضاحت دینا مناسب نہیں سمجھتا اور تمہیں تو بالکل بھی نہیں۔“  
”عالیان!“ اس کے آنسو نکل ہی آئے اور آواز رندہ گئی۔ اور اس کی آواز نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ عالیان کے آگے وہ کچھ بول ہی نہیں سکی اور اس نے جانے کے لیے قدم آگے بڑھا دیے۔  
”تم مسلمان ہو۔“ امرجہ نے تیزی سے اس کے آگے آکر کہا۔

”جب میرے باپ کا ہی نہیں پتا تو میرے مذہب کا کیسے پتا ہو گا۔ اور اگر میں مسلمان ہوں بھی تو تم جتنا

بھی لا جواب کروئے پر قدرت رکھتا تھا۔ امرجہ اس کی شکل دیکھتی نہ رہ جاتی تو کیا کرتی؟  
”دیر اور کامل نے مل کر۔۔۔ عالیان۔۔۔ وہ سب۔۔۔ کامل نے اپنی مرضی سے ایڈجسٹنگ کی۔۔۔“  
”میں جانتا ہوں۔“  
”تم پھر بھی مجھ سے ناراض ہو؟“ وہ پھر سے یہ پوچھنے کی جرأت نہ کر سکی کہ تم کہاں چلے گئے تھے اور کیوں؟

”نہیں۔۔۔ ناراض ہونے کے لیے وجہ کا ہونا ضروری ہے۔ تمہارے اور میرے درمیان اب کوئی وجہ نہیں رہی۔“ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا امرجہ کے قریب سے دور ہو جانے کی آج اسے کتنی جلدی تھی۔  
”جو؟“ کہہ چکا تھا وہ اب تم اور میں کہہ رہا تھا۔  
”عالیان! میری بات سنو۔“ وہ اس کے پیچھے لپکی۔  
”وہ سب ویسے نہیں تھا۔۔۔ وہ تو۔۔۔“  
”کیا سب ویسے نہیں تھا۔ جو تم نے کہا وہ سب۔۔۔ کیا وہ سب تم نے نہیں کہا تھا؟“  
”میں نے کہا تھا لیکن۔۔۔“

”تو تم کس بات کی وضاحت کے لیے اس وقت یہاں کھڑی میرا وقت برباد کر رہی ہو؟“  
یکدم خون نے اپنی رفتار کو خطرناک حد تک بڑھا کر خود کو جلد کر لیا۔ امرجہ اسے اسی جلد حالت میں سن سہی دیکھتی رہ گئی۔ اس کی قسمت خراب۔ بہت زیادہ خراب کہ وضاحت وہ اب بھی نہیں دے سکتی تھی۔ اتنی ذہین تھی ہی نہیں۔ اتنی بہادر تو کبھی بھی نہیں رہی تھی۔ اب وہ کسی بھی چال پر کوئی بھی پتا چھیننے کی بازی مات ہی رہنے والی تھی۔

”میری ماں ایک بری عورت تھی۔ ایک آزاد معاشرے کی دلدار۔ گناہ گار اخلاقی مذہبی حدود کو پھلانگنے والی اور کیا کیا کہتے ہیں تمہارے مشرق میں ایسی عورت کو۔ یقیناً بہت سے نام ہوں گے ایسی عورتوں کے لیے۔ جو تم بھول جانے کی وجہ سے کہہ نہ سکتی ہو۔ لو اب کہہ لو۔ میں سن رہا ہوں۔“ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے اور مکمل فرصت اور



دوسرے خطوں کے مسلمان لڑکے لڑکیاں جو آزادانہ کلیوں اور باروں میں جاتے، ناپتے، گاتے، شراب نوشی کرتے۔

وہ خاندان کی حیثیت سے ایک فرد کی حیثیت سے کے مثال بنا کر پیش کرتی کہ دیکھو کتنے اچھے مسلمان ہیں۔ وہ قوم کے نام پر کس قوم کو اس کے آگے کرتی کہ دیکھو ہم کیسے کامل ہیں۔ ہمارے ظاہر و باطن میں تضاد نہیں ہے۔ باپ بھئی موٹی برائیاں الگ، لیکن ہم میں کوئی بڑی برائی نہیں ہے۔ ایک جائز بچہ جو مسلمان خاندان میں پیدا ہوتا ہے وہ شراب سے حرام کھائے اور تمام ہندی اصولوں کو توڑ ڈالے، پھر بھی وہ ایک ”مسلمان“ ہے کیونکہ ایک تو وہ مسلمان خاندان میں پیدا ہوا ہے دوسرا ”پیدائشی مسلمان“ ہے۔ ”میرے دادا ایک اچھے انسان ہیں۔ اچھے مسلمان۔“ مثال بنا کر پیش کرنے کے لیے اس کے پاس صرف ایک دادی تھی۔

عالیان نے اسے ایسی نظر سے دیکھا کہ امرہ جان پائی کہ بنا ایک لفظ کے افسوس کا اظہار کیسے کیا جاتا ہے۔ اس نے جانا کہ اگر دادا اتنے ہی اچھے ہیں تو وہ کیوں ان جیسی اچھی نہیں ہے۔ عالیان نے اس ایک نظر میں اتنا کچھ کہہ دیا کہ امرہ پر چپ کا گہرا تالا لگ گیا۔

”مجھے تم پر یہ ثابت نہیں کرنا کہ میں کتنا اچھا انسان ہوں۔ برائے نام ہی سہی اپنا ماضی بھی مجھے تم پر نہیں کھولنا۔ کیونکہ اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ کیوں نہیں رہی یہ تم بہتر جانتی ہو۔ اب تم ایک کام کرنا۔ جو مجھے بھی کرنا ہے یونی میں۔ ماچھنڈر میں کوئی عالیان نہیں ہے۔ اس زمین پر کوئی امرہ نہیں ہے۔ میں تمہیں نہیں جانتا۔“

وہ ایسی باتیں کرتا بھی جانتا ہی تھا۔ جس کے لیے وہ ”سب“ بھی اب وہ اس کے لیے ”کوئی امرہ نہیں“ ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔

تف ہے ہامبت بر جو اپنی پیشانی پر پان کے پتے کا

اچھا مسلمان نہیں ہوں۔ میں نے بہت ایسی رپورٹیں اور فیچرز پڑھے ہیں جن کے مطابق کسی غیر مسلم کے اسلام کو اپنا لینے پر اسے مسلمان تو مان لیا جاتا ہے لیکن معاشرے میں اسے وہ درجہ نہیں دیا جاتا جو ایک پیدائشی مسلمان کو دیا جاتا ہے۔ ایک عربی تاجر نے ایک نو مسلم کو اپنے ساتھ کھانا کھانے کی اجازت تو دی لیکن، تاجر کے خاندان میں شادی کی خواہش کے اظہار پر اسے ملک بدر کر دیا۔ مجھے پوچھ لینے کی اجازت دو کہ تم سب لوگ جائز۔ اچھے شریف خاندان والے۔ نیک بیویوں والے۔ تم کتنے اچھے مسلمان ہو۔ تم حلال فوڈ کھاتے ہو۔ حرام سے پرہیز کرتے ہو۔ تم جن کے اسلامی نام ہوتے ہیں۔ دور دور تک جن کی نسلوں میں کسی مشرک کا خون شامل نہیں ہوتا۔ کتنے اچھے مسلمان ہوتے ہو؟“

ہاتھ باندھے عالیان اس کے معاشرے پر طمانچہ مار رہا تھا۔ وہی معاشرہ جہاں امرہ کو منحوس ہونے کا لقب ملا۔ وہ اتنے اچھے مسلمان تھے کہ اس کی پیدائش کو لے کر توہمات کا شکار تھے اور کوئی ایک دو نہیں۔ ہر ایک۔ جس سے اسلام نے سختی سے منع کیا تھا۔ اس کے خلاف وہ سختی سے عمل پیرا تھے۔ اس کے ماموں جو کئی گج کر چکے تھے انہوں نے اس کی نحوست کی وجہ سے اپنے بیٹے کے لیے اس کا رشتہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اس کی دادی جو تنہا گزار تھیں اور فارغ وقت میں سبج پڑھا کرتی تھیں، وہ اس کی موجودگی میں کوئی خوشی کی بات نہ کیا کرتی تھیں کہ مبادا خوشی دکھ میں بدل جائے۔

اس کے مئی خالہ زاد، ماموں زاد، خاندان کی تقریبات میں چھپ کر — پیا اور پلایا کرتے تھے۔

امرہ کے بھائی جنہوں نے رمضان کے علاوہ بھی نماز کی ادائیگی نہیں کی تھی۔ انہیں سنت اور فرائض کے بارے میں برائے نام

معلومات تھیں۔ اور یونیورسٹی کے مشرق وسطیٰ اور



جان نکال کر لے گیا تھا۔ کیا وہ ایسا ہی تھا۔ کتنا برا تھا وہ۔ بہت برا۔ اسے بس سے واپس گھر آنا تھا۔ لیکن وہ پیدل چلنے لگی۔ منہ سے بھاپ نکالتے۔ پیروں کو برف پر ٹھہرتے۔

اگر ان کے درمیان یہ سب نہ ہو چکا ہوتا تو اس وقت اس کے ساتھ، اس کے پیچھے، اس کے پہلو میں عالیان چل رہا ہوتا۔ جو اس کے ساتھ رہنے کے لیے فضول فضول بہانے گھڑ لیا کرتا تھا۔

امرحہ نے دونوں ہاتھ رگڑے کتنی ٹھنڈی مائچسٹریں۔ افس۔ اتنی ٹھنڈ۔ اتنی ٹھنڈ کہ وہ زندہ کو مردہ کر رہی تھی۔ ایسا غضب کا موسم۔ جو زندوں کو مردہ کر دے۔ ایسے موسم سے خدا بچائے۔

ایسے موسم سے خدا کی پناہ۔

گھر آتے ہی اس نے ویرا کے کمرے کے دروازے کو دھکے سے کھولا۔ ویرا الپ ٹاپ پر بیٹھی کام کر رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک زنانے دار تھپڑ اس کے گلانی گال پر دیا۔

”تم نے میرے ساتھ بہت برا کیا۔ جو میں نہیں چاہتی تھی، وہی ہوا۔ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگا ہے۔“ وہ پوری شدت سے دھاڑی۔

گال پر ہاتھ رکھ کر ویرا اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھنے لگی۔

”مجھے نہیں معلوم تھا امرحہ کہ یہ سب ایسے اتنا پیچیدہ ہو جائے گا۔“ ویرا نے اسے شانوں سے تھام کر کرسی پر بٹھانا چاہا لیکن وہ کاربٹ پر ڈھیر ہوئی چلی گئی۔

”تم تو میری دوست تھیں۔ اب تم نے کسی کو بھی میرا دوست نہیں رہنے دیا۔“

”امرحہ۔ ویرا بری نہیں ہے۔ تم۔“ ویرا اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”تم بری نہیں ہو۔ پر میرے ساتھ تو برا کر دیا۔ تا۔ کر دیا تا برا۔ اب اچھا کون کرے گا۔“

نصیب کند کروالیتی ہے لھایا۔ چنایا۔ تھوکر دیا۔ محبت شروع ہونے میں وقت لیتی ہے، ختم ہونے میں کیوں نہیں لیتی۔ یہ محبت ہو جانے کے بعد خود کو مہرند کیوں نہیں کرتی۔ سختی سے کسی مضبوط تابوت میں۔ فرعونوں کے خفیہ معبود کی مانند۔ زمین کی تہوں میں جگہ بدلتے قارون کے خزانے کی طرح۔

یہ محبت اپنے آگے پیچھے دائیں بائیں اتنے دشمن لیے کیوں چلتی ہے؟

یہ مجھ مجھ کیوں جاتی ہے۔ صرف روشن، روشن، روشن ہی کیوں نہیں رہتی۔

اس ریب کی لو پر ہوائیں تحس جادو گریوں کی طرح کیوں منڈلاتی پھرتی ہیں۔ اپنی راجدھانی میں یہ ایسے دشمنوں کو جگہ کیوں دیتی ہے؟ اگر ایسی ہی بات ہے پھر تو جیسے کوئی بات ہی نہیں ہے۔

اگر یہی سب ہے تو بس بھر کچھ بھی تو نہیں ہے۔ ہاں کچھ بھی تو نہیں، عالیان جا رہا ہے۔ اس کے آگے۔ اس سے دور۔ مکر وہ ایسے چل رہا ہے جیسے اپنے مرکز سے پھٹ چکا ہو۔ اس کے وجود میں جڑ پکڑ چکے ارتعاش کو کم بینائی والے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ چال کو مضبوط بنانے کے لیے اسے تردد کرنا پڑ رہا ہے۔ گھوڑے کا شہر سوار منہ کے بل زمین پر گرا ہے۔ اس کا وجود اس خاک سے اٹا پڑا ہے جسے سوار تا عمر اپنے وجود سے جھاڑ نہیں پاتا۔

وہ شدت سے ہانکی جانے والی دعا اور میدان میں ہی چھوڑ دیے جانے کی عملی صورت لگ رہا تھا۔ اس کے وجود سے چھوٹے سب ہی اشارے پانال کی طرف بڑی وضاحت سے اہستہ تھے۔

امرحہ وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ وہ چلا گیا تب بھی۔ جانا تو اسے بھی تھا بس وہ قوت جو چلنے، پھرنے، بولنے کے لیے ضروری ہوتی ہے وہ قوت وہ ساتھ لے گیا تھا۔

عالیان مارگریٹ۔ وہ کیسا انسان تھا۔ وہ اس کی



# پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

## یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

### ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✧ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو مائیل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو
- ✧ ہر پوسٹ کے ساتھ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

➡ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

# WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on  
Facebook

[fb.com/paksociety](https://fb.com/paksociety)



[twitter.com/paksociety1](https://twitter.com/paksociety1)

WWW.PAKSOCIETY.COM